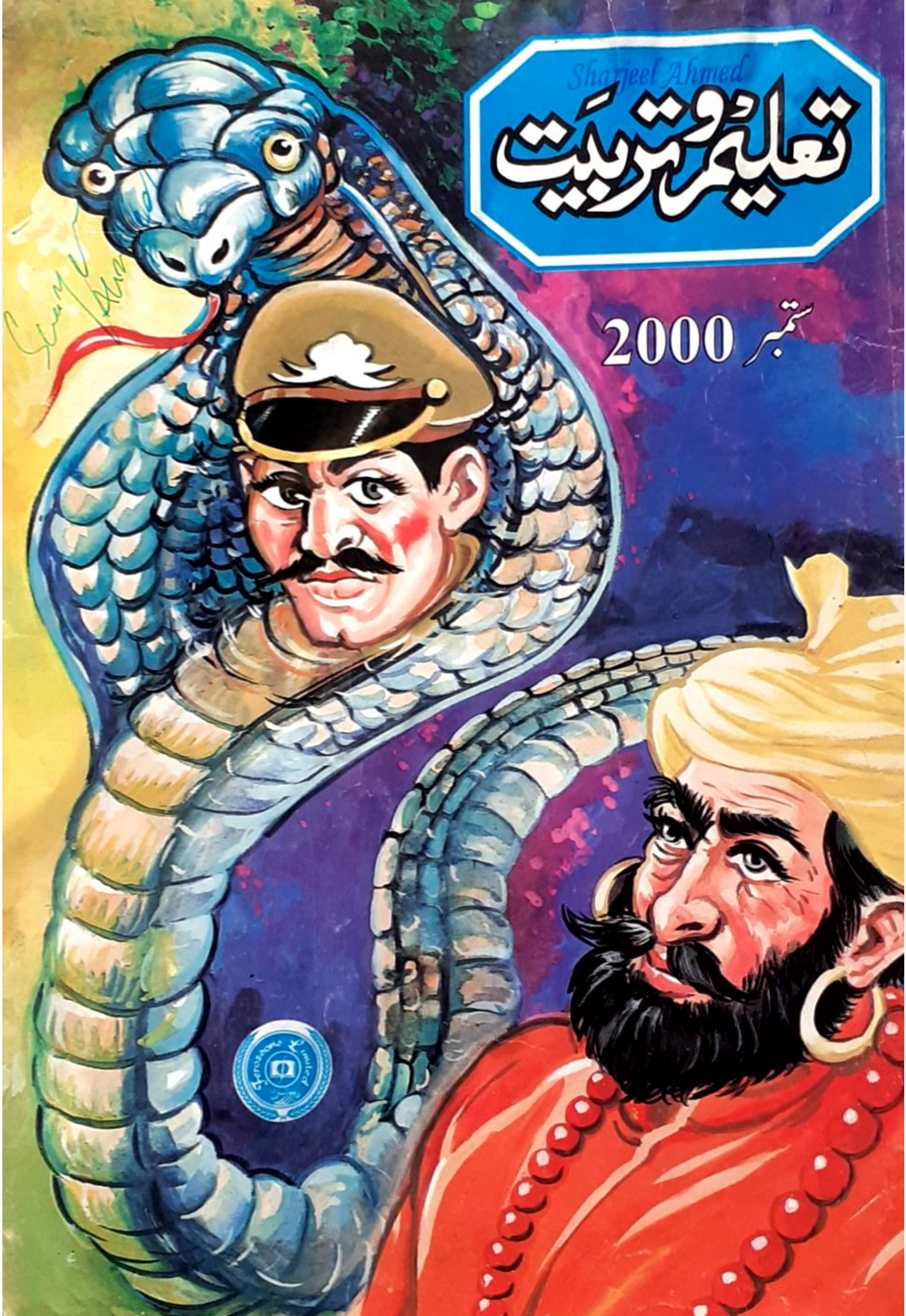

تعلیم و تربیت

Sharjeel Ahmed

ستمبر 2000

چیف اڈیٹر: عبد السلام
اڈیٹر و پبلشر: ظہیر سلام
مشیر: سعید لخت
سینئر اسسٹنٹ اڈیٹر: رضوان ثاقب
خصوصی مشیر: محمود حسن رومی
اسسٹنٹ اڈیٹر / ڈیزائننگ: شوکت اعجاز
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

لاش کی چوری

آب حیات کی تلاش میں ہمیں کہاں جانا چاہیے؟ وہ کون سی چیز ہے جسے خدا نہیں دیکھتا؟ بادشاہ کی لاش تہ خانے سے کس نے چوری کی؟ وہ کون سی چیز ہے جو وقت کی قید سے آزاد ہوتی ہے؟ ان سولات کے جواب آپ آیندہ ماہ ذی شان ہاشمی کی تجسس ایڈونچر اور دل چسپی سے بھرپور کہانی میں ملاحظہ فرمائیں۔

Sharjeel Ahmed

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

تعلیم و تربیت کا شمارہ جس وقت آپ کو ملے گا اس وقت اسکول کھل چکے ہوں گے اور آپ کی پر عزم تعلیمی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہوں گی۔ خوب دل لگا کر پڑھیے اور امتحان میں شان دار کامیابی حاصل کیجیے۔ لیکن اپنے آپ کو درسی کتابوں تک ہی محدود نہ رکھیے۔ جو بچے صرف درسی کتابوں کا ہی مطالعہ کرتے ہیں وہ کولھو کے بیل کی مانند ہوتے ہیں جو ایک ہی دائرے میں گھومتا رہتا ہے۔ اس لیے نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ آپ کو فرصت کے وقت ایسی غیر نصابی کتابیں بھی پڑھنی چاہئیں جن سے آپ کے علم میں اضافہ ہو۔

6 ستمبر کو آپ یوم دفاع منائیں گے۔ ستمبر کی اسی تاریخ کو آج سے 35 سال پہلے بھارت نے ہماری سرحدوں پر حملہ کر دیا تھا مگر ہماری بہادر فوجوں نے اسے عبرت ناک شکست دی تھی۔ اس شان دار فتح کے موقع کی یاد میں یہ دن پاکستانی قوم پورے جوش و خروش کے ساتھ مناتی ہے۔ گزشتہ ماہ یوم آزادی کے حوالے سے بچوں کے مختلف پروگرامات ہوئے۔ ہمیں بھی چند ایک میں شرکت کا موقع ملا۔ ان پروگراموں میں ہمیں اس بات کا احساس پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہوا کہ ہمارے بزرگوں نے یہ ملک بے پناہ قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا اور ہمارے نونہال اس کی حفاظت کے لیے اس سے بھی زیادہ قربانیاں دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ اللہ کرے ہمارے دلوں اپنی آزادی کے تحفظ کا یہ جذبہ تاقیامت زندہ رہے۔

اسی مہینے کی 11 تاریخ کو ہمارے محبوب قائداعظم محمد علی جناح ہم سے جدا ہوئے تھے۔ آپ پاکستانی قوم کے عظم محسن ہیں۔ آپ اور آپ کے مخلص ساتھیوں کی ان تھک کوششوں سے ہی ہمیں یہ پیارا وطن پاکستان ملا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت میں اونچا درجہ دے (آمین) اڈیٹر۔

ستمبر
2000ء

پرنٹر: عبد السلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

سرورق: ایک سپیرا ایک لٹیرا

قیمت فی پرچہ: 15 روپے
(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

اس شمارے میں

عظیم ماں (سچی کہانی)	سید نظر زیدی	2
وطن کے محافظ (نظم)	ضیاء الحسن ضیا	4
آخری سورج (کہانی)	شکیل زاہد	5
بے وقوف رحموں (سنی سنائی)	زبیدہ سلطانہ	8
مایوسی سے بچو (درس قرآن)	ڈاکٹر عبد الرؤف	10
ایک سپیرا ایک لٹیرا (کہانی)	حامد مشہود	11
عذر قبول کیا جائے (کہانی)	زاہدہ پروین	18
دوستی کا تحفہ (سائنس فکشن)	حسن ذکی کاظمی	21
چاچا چاند بے پہلوان (کہانی)	محمد معروف چشتی	27
شکاری بادشاہ (کہانی)	سلیم خان گمی	31
کرکٹ کیا اور کیسے؟	ابن الطاف	34
کیوں؟ (معلومات)	عبد الستار خان طاہر	38
بہترین مقابلے (کہانی)	نجمہ معراج	42
آپ کا خط ملا		49
مار خور (جنگلی حیات)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	52
آپ بھی لکھیے		54
کارٹون کہانی	شاہد ریاض شاہد	60
آپ کے دستر خوان		62
بوندیں (نظم)	سید عظیم و اصلی	63
گڑھے میں لاش (قسط 6)	اشتیاق احمد	64

باقی سب دل چسپ سلسلے حسب معمول

سالانہ قیمت: پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
مشرق وسطی افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے
امریکا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815 - 6278816 - 6361309 - 6361310

سچی کہانی

سید نظر زیدی

عظیم ماں

Sharjeel Ahmed

کوئی دو سو برس پہلے کی بات ہے شہر دہلی میں بہت معزز خاندان کی ایک خاتون رہتی تھیں۔ ان دنوں اس شہر میں رہنے والے مسلمان بہت پریشانی کی زندگی گزار رہے تھے۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریزوں نے ان کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا تھا اور ان کے ساتھ بہت برا سلوک کر رہے تھے۔ ملکوں پر قبضہ کرنے والی قومیں ان کے ساتھ برا سلوک ہی کیا کرتی ہیں۔ جن کے ملکوں پر وہ قبضہ کرتی ہیں انہیں ڈر ہوتا ہے کہ شکست کھانے والے اپنا ملک حاصل کرنے کے لیے کوشش نہ کریں' لیکن یہاں ہندوستان پر قبضہ کرنے والے انگریز تو مسلمانوں کے لیے اس لیے بھی عذاب بن گئے تھے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں' جو اس ملک کے باشندوں نے ان کے خلاف لڑی تھی' انگریزوں کا بہت جانی نقصان ہوا تھا اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ ان کے خلاف یہ جنگ مسلمانوں ہی نے شروع کی تھی۔

شہر دہلی مسلمانوں کی حکومت کا پایہ تخت تھا۔ آخری مغل بادشاہ سراج الدین ظفر اسی شہر میں رہتا تھا۔ اس کے امیروں وزیروں کے شان دار محلات بھی اسی شہر میں تھے۔ انگریزوں نے وہ محلے اجاڑ دیئے تھے جن میں یہ محلات تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اچھی حیثیت رکھنے والے سب مسلمانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ ان کے گھر لوٹ لیے تھے۔ جائیدادوں پر قبضہ کر لیا تھا اور جو ہاتھ لگا تھا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بس ان کی جانیں بچی تھیں جو کہیں چھپ گئے تھے یا شہر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

بیان کیا گیا ہے ایک خون خوار انگریز فوجی افسر ہڈسن نے بادشاہ کے بیٹوں کے کٹے ہوئے سر یہ کہہ کر اس کے سامنے رکھے تھے کہ میں آپ کے لیے خاص تحفہ لایا ہوں۔

عام مسلمانوں کے ساتھ جو ظالمانہ اور بہت ہی برا سلوک کیا گیا اسی کا حال پڑھ کر دل غم میں ڈوب جاتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے۔ ان وحشی گوروں' سکھوں اور ڈوگروں نے کوئی بڑی حویلی تاراج کیے بغیر نہ چھوڑی۔ کئی ہفتوں تک جنگی عدالتوں میں جنہیں بوچڑ خانے کہنا چاہیے' محلے محلے کے مسلمان شرفا گھیر کر لائے جاتے تھے اور ان سے پوچھا جاتا تھا کہ انہوں نے کمپنی بہادر کی کیا خیر خواہی کی؟ اگر کوئی خیر خواہی ثابت نہ کر سکتا تو گولیوں سے اڑا دیا جاتا یا خرچ بچانے کے لیے پھانسی دے دیا جاتا۔ صرف دہلی میں 27 ہزار مسلمان قتل کیے گئے"۔

مسلمانوں کی تباہی کی درد بھری کہانی تو ہم نے یہ بتانے کے لیے لکھی کہ جو قومیں بہادر اور شریف رہ کر اپنی آزادی کی حفاظت نہیں کرتیں ان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اصل میں ہم حال بیان کر رہے تھے دہلی شہر میں رہنے والی ایک نیک خاتون کا۔

اگرچہ اس بربادی میں اس خاتون کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچا تھا کیوں کہ اس کا بیٹا انگریزوں کی حکومت میں عہدے دار تھا' لیکن قوم کی تباہی کے غم میں وہ برابر کی شریک تھی اور شاید اسی غم نے اسے بہت بیمار کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر میں تھا۔ یہاں اس کی خدمت اور دیکھ بھال کرنے والی بس ایک غریب عورت تھی۔ جو اس کی حویلی کی کوٹھڑی میں رہتی تھی۔

یہ نیک دل خاتون مصیبت کے دن بہت حوصلے اور صبر سے گزار رہی تھی کہ اچانک اس پر ایک اور مصیبت آپڑی اور وہ یہ کہ جو غریب عورت اس کی خدمت میں لگی رہتی تھی وہ بھی بیمار ہو گئی اور مزے کی بات یہ کہ اس غریب کو بیماری بھی وہی لگی جس میں اس کی مخدومہ مبتلا ہوئی تھی۔

ان دونوں بیماروں میں غریب عورت تو اس قابل تھی ہی نہیں کہ حکیم کے پاس جاتی اور دوا لاتی۔ لیکن دوسری خاتون اچھی خاصی امیر تھیں۔ انہوں نے شہر کے بہت اچھے حکیموں سے علاج کروایا اور ساتھ ہی اپنی بیماری کی ساری کیفیت اپنے بیٹے کو بھی لکھ دی۔ ان کا بیٹا ماشاء اللہ اونچے سرکاری عہدے پر کام کر رہا تھا۔ اسے اپنی ماں کے بیمار ہونے کا حال معلوم ہوا تو فوراً ایک قابل طبیب سے ملا اور بہت قیمتی دوا تیار کروا کے بھجوا دی۔

دوا ملی تو ماں خوش ہو گئی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اسے یقین آیا کہ اس کا بیٹا اس کا خیال رکھتا ہے' دوسرے اس امید سے کہ دوا کھانے سے وہ جلد ہی تن درست ہو جائے گی۔ دوا وصول کرنے کے بعد وہ اسی طرح کی باتیں سوچ رہی تھی کہ اچانک اسے غریب عورت کا خیال آگیا۔ اس بے چاری کو بھی اسی بیماری نے پریشان کر رکھا تھا جس میں وہ خود مبتلا تھی۔ لیکن اس کا کوئی بیٹا نہ تھا جو اس کے لیے قیمتی دوا بھیجتا۔ نہ وہ خود اتنی سکت رکھتی تھی کہ اپنے لیے خود دوا خرید کر لاتی۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے وہ نیک دل خاتون بہت غم گین ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ایسی ہی قیمتی دوا اس کی غریب خادمہ کو بھی مل جائے اور اس کے ساتھ وہ بھی صحت یاب ہو جائے۔ وہ کافی دیر اس معاملے پر غور کرتی رہی۔ آخر ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ بیماری کی حالت ہی میں پلنگ سے اتری اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی خادمہ کی کوٹھڑی میں پہنچ گئی اور وہ دوا جو اس کے بیٹے نے بھیجی تھی اسے دیتے ہوئے کہا "لو بوا' اللہ کا نام لے کر یہ دوا استعمال کرو۔ سچے رب کو منظور ہوا تو جلد ہی بھلی چنگی ہو جاؤ گی"۔

غریب عورت نے دوا لے کر خاتون کا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ اٹھا کر اس کے لیے دعائیں مانگنے لگی۔ "بی بی جی اللہ آپ کا بھلا کرے۔ وہ معبود برحق آپ کو جلد شفا دے۔ آپ میرا کتنا خیال رکھتی ہیں"۔

دوا دے کر نیک دل خاتون لوٹ آئی اور صبر شکر سے وقت گزارنے لگی۔ جس طرح اس نے اپنی دوا غریب عورت کو دے دی تھی اس کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا کہ اس کی بیماری بڑھتی لیکن اللہ کی خاص مہربانی سے یہ نرالی بات ہوئی کہ دوسرے دن ہی سے تکلیف کم ہونی شروع ہو گئی اور چند دنوں ہی میں یہ دونوں خواتین تن درست ہو گئیں۔ غریب خاتون قیمتی دوا کھانے سے اور امیر خاتون دوا کھائے بغیر ہی۔ غریب خاتون نے خوش ہو کر اس کے لیے دعا مانگی اور اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی۔

کچھ عرصے بعد امیر خاتون کا بیٹا دلی آیا تو خوش ہو کر بولا "امی جان' اللہ کے فضل سے اس دوا نے آپ کو بہت فائدہ پہنچایا"۔

ماں ہنستے ہوئے بولی۔ "ہاں بیٹا لیکن اللہ دوا کھائے بغیر بھی تو شفا دے سکتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے غریب عورت کو دوا دے دینے کا واقعہ سنایا۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو یہ سن کر ناراض ہوتا کہ جو دوا اس نے اتنا روپیہ خرچ کر کے بنوائی تھی غریب عورت کو دے دی' لیکن یہ بیٹا بھی اپنی ماں کی طرح بہت نیک دل اور دوسروں کا بھلا چاہنے والا تھا۔ اس نے ماں کی تعریف کی کہ اس نے واقعی ایک اچھا کام کیا۔

ہمارا خیال ہے یہ کہانی پڑھنے والے بچے یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں گے کہ یہ نیک دل خاتون کون تھی جس نے اپنی جان کی پروا نہ کی اور قیمتی دوا غریب عورت کو دے دی؟

تو بھئی یہ عظیم خاتون تھی ہمارے عظیم راہ نما اور محسن سر سید احمد خان رحمتہ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ۔ ہمارے مشہور قومی شاعر اور بہت بڑے ادیب خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے حیات جاوید نام کی کتاب میں سر سیدؒ کی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ اس کتاب میں درج ہے۔ ہم نے وہیں سے لے کر کہانی کی صورت میں لکھا ہے۔

ضیاء الحسن ضیا

وطن کے محافظ

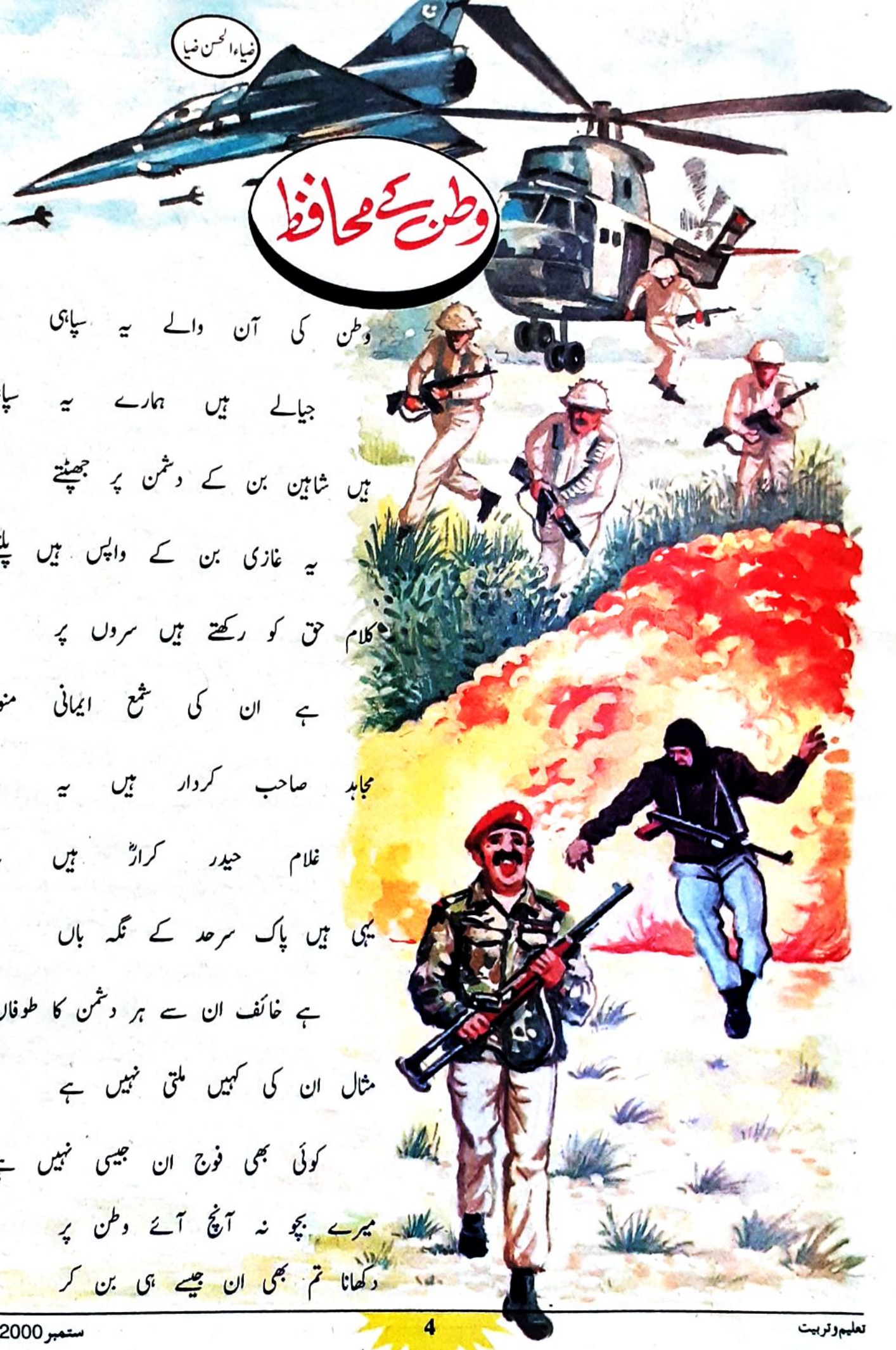

وطن کی آن والے یہ سپاہی
جیالے ہیں ہمارے یہ سپاہی
ہیں شاہین بن کے دشمن پر جھپٹتے
یہ غازی بن کے واپس ہیں پلٹتے
کلام حق کو رکھتے ہیں سروں پر
ہے ان کی شمع ایمانی منور
مجاہد صاحب کردار ہیں یہ
غلام حیدر کرارؓ ہیں یہ
یہی ہیں پاک سرحد کے نگہ باں
ہے خائف ان سے ہر دشمن کا طوفاں
مثال ان کی کہیں ملتی نہیں ہے
کوئی بھی فوج ان جیسی نہیں ہے
میرے بچو نہ آنچ آئے وطن پر
دکھانا تم بھی ان جیسے ہی بن کر

آخری سورج

شکیل زاہد

"یہ کام کرتے ہوئے تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ تم کل کا سورج نہ دیکھ سکو" میجر اکرام نے کہا۔

"جی سر' میں سمجھتا ہوں سر" میں نے کہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دھوپ کی طرف دیکھا۔

"آپریشن رات کے 3 بجے شروع ہو گا۔ یہ وہ وقت ہے جب انسان پر نیند کا غلبہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہی وقت ہمارے جاگنے اور چوکس رہنے کا ہو گا۔ بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے نا؟"

"جی سر" میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ لیکن میں رہ رہ کر باہر کی دھوپ دیکھ رہا تھا۔ کیا واقعی یہ میری زندگی کا آخری دن ہے؟

"تمہارے ساتھ تین آدمی اور ہوں گے۔ تمہارے پاس پستول' چاقو اور کلاشن کوف ہو گی۔ دستی بم رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیوں کہ اس سے بے گناہ لوگوں کی جانوں کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ کوشش کرنا کہ کلاشن کوف بھی چلانے کی نوبت نہ آئے"۔

"جی سر"

"تم کن تین کو اپنے ساتھ لے جانا پسند کرو گے؟"

میں اپنے خیالات سے چونکا۔ "سر! نوید' اسلم اور طارق" میں نے تیزی سے کہا۔

"ہوں" میجر اکرام سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا "اسلم اب بڑا ہو گیا ہے۔ اس لیے اب اس میں وہ پہلے والی چستی نہیں رہی۔ تمہارے مشن میں ایک ایک لمحہ قیمتی اور پہلے سے پلان شدہ ہے۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی سارے مشن کا بیڑہ غرق کر سکتی ہے"۔

"میں سمجھتا ہوں سر لیکن اسلم کو ایسی کارروائیوں کا وسیع تجربہ ہے۔ اس کا ساتھ یقیناً فائدہ مند ثابت ہو گا"۔

میجر اکرام پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ تجربے اور عمر کو ترازو کے پلڑوں میں ڈال کر تول رہا تھا۔ کئی منٹ خاموش ہی گزر گئے۔ میں بھی خاموش رہا۔

"ٹھیک ہے" تجربہ بھاری ثابت ہوا۔ "اسلم کو لے جاؤ۔ اب جاؤ اور تین گھنٹے بعد مجھے ملنا"۔

میں نے سیلوٹ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دشمن ملک کا ایک طیارہ اغوا ہو کر ہمارے ملک میں اتر گیا تھا۔ دشمن کا دعویٰ تھا کہ یہ طیارہ خود ہمارے ملک نے ہی اغوا کروایا ہے۔ طیارے میں ایک سو چار دشمن ملک کے اور تین ہمارے ملک کے مسافر آٹھ امریکی اور چوبیس یورپین سوار تھے۔ عملے کے تیرہ افراد علیحدہ تھے۔ اغوا کرنے والوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر طیارہ ہمارے ملک کے ہوائی اڈے پر اترنے نہ دیا گیا تو وہ طیارے کو بم سے اڑا دیں گے اور خود پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگا دیں گے۔ اغوا کرنے والوں کی صحیح تعداد کا کسی کو علم نہیں تھا۔ ہمارے ملک کی حکومت نے انسانی ہم دردی کی بنا پر طیارے کو ہوائی اڈے پر اترنے کی اجازت دی تھی۔ اس پر دشمن نے خوب واویلا مچایا تھا کہ دراصل اغوا کرنے والے اسی ملک کے باشندے ہیں۔ میرے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ رات کی تاریکی میں جہاز کے اندر داخل ہو جاؤں اور اغوا کرنے والوں کو مار ڈالوں یا انہیں زندہ گرفتار کر لوں۔ انہیں زندہ گرفتار کرنا زیادہ مفید ثابت ہوتا تاکہ یہ پتا چل سکے کہ وہ کون ہیں۔ میں' اسلم' نوید اور طارق اپنے ملک کی آرمی

کے بہترین کمانڈوز میں شمار ہوتے تھے۔ میں نے جنگلوں میں کئی کئی مہینے بغیر ہتھیار اور راشن کے زندہ رہ کر گزارے تھے۔ صحرا میں بغیر پانی کی چھاگل کے گزارہ کیا تھا۔ کئی کئی گھنٹے سمندر میں گزارے تھے۔ کمانڈو ٹریننگ کے بعد میرا جسم فولاد کا بن چکا تھا۔ بڑے سے بڑے پہلوان کو چاروں شانے چت کرنا میرے لیے سکنڈوں کا کھیل تھا۔ خود خالی ہاتھ ہوتے ہوئے دشمن کی پستول چھین کر اس کے سینے میں اس پستول کی گولی اتارنے میں مجھے پانچ سکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ لیکن جو چیز مجھے پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ جہاز میں اغوا کرنے والوں کے علاوہ ایک سو بیالیس افراد سوار تھے جن کی حفاظت کرنا بھی ہماری ہی ذمہ داری تھی۔ ہماری ذرا سی بھول چوک کسی بے گناہ کی جان لے سکتی تھی۔

تین گھنٹے بعد ہی نوید، اسلم اور طارق میجر اکرام کے کمرے میں جمع ہوئے۔ کمرے میں اور لوگ بھی موجود تھے۔ میز پر ایک بڑا سا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ چند اور نقشے لپیٹ کر رکھے ہوئے تھے۔ پھیلا ہوا نقشہ ہوائی اڈے کا تھا۔

"یہ ہوائی اڈے کا نقشہ ہے" میجر امجد علی نے کہنا شروع کیا "یہ وہ رن وے ہے جس پر اغوا شدہ جہاز کھڑا ہے"۔ اس نے رن وے پر ایک جگہ سرخ قلم سے کاٹے کا نشان لگایا "یہاں پہنچنے کے تین راستے ہیں۔ ایک لاؤنج کی طرف سے، دوسرا ہینگر کی طرف سے اور تیسرا اس اجاڑ میدان کی طرف سے جو رن وے کے پرے واقع ہے۔ میرے خیال میں یہ تیسرا راستہ بہترین رہے گا کیوں کہ اس طرف اغوا کرنے والوں کا دھیان کم سے کم ہوگا"۔ امجد علی نے اجاڑ میدان پر انگلی رکھی۔ "آپ لوگ یہاں سے جہاز کی طرف بڑھیں گے۔ جہاز کے پچھلے پہیوں کے پاس پہنچ کر رک جائیں گے۔ جہاز اس ماڈل کا ہے جس کے پہیوں کے کھلنے پر پہیوں کے ذریعے جہاز میں جانا ممکن ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ حصہ کھلا رہتا ہے۔ جب پہیے جہاز کے اندر چلے جاتے ہیں تو یہ خانہ بند ہو جاتا ہے"۔

یہ میٹنگ چار گھنٹے تک جاری رہی۔ ایک ایک سکنڈ کا پلان طے ہو چکا تھا۔ اب ہمیں رات کے تین بجے کا انتظار کرنا تھا۔ ہم اپنے اپنے کمروں میں گئے اور سو گئے۔ یہ سونا بے حد ضروری تھا تاکہ ہم رات تین بجے پوری طرح چاق و چوبند ہوں۔

رات کے ڈیڑھ بجے میری آنکھ خود بخود کھل گئی۔ کمانڈو ٹریننگ نے میرے اندر ایک گھڑی لگا دی تھی۔ مجھے سوتے میں بھی وقت کا پتا چلتا رہتا تھا۔ میں اٹھا ہاتھ منہ دھویا اور تیاری شروع کر دی۔

دو بج کر پانچ منٹ پر ہم ایک گاڑی میں سوار ہوئے جو ہمارے ہی انتظار میں کھڑی تھی۔ گاڑی چلی اور ہمیں جانے کہاں کہاں سے گھما پھرا کر دو بج کر تیس منٹ پر اس اجاڑ میدان میں پہنچا دیا جو رن وے کے پرے واقع تھا۔ یہاں پہنچ کر گاڑی جھاڑیوں کے اندر خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ ہم گاڑی سے اترے۔ ہم سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے جس نے ہمیں سر سے پیروں تک ڈھکا ہوا تھا۔ ہتھیار ہمارے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہاں سے ہوائی جہاز تک کا فاصلہ طے کرنے میں سترہ منٹ لگتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں جہاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ جب دو بج کر چالیس منٹ ہوئے تو میں

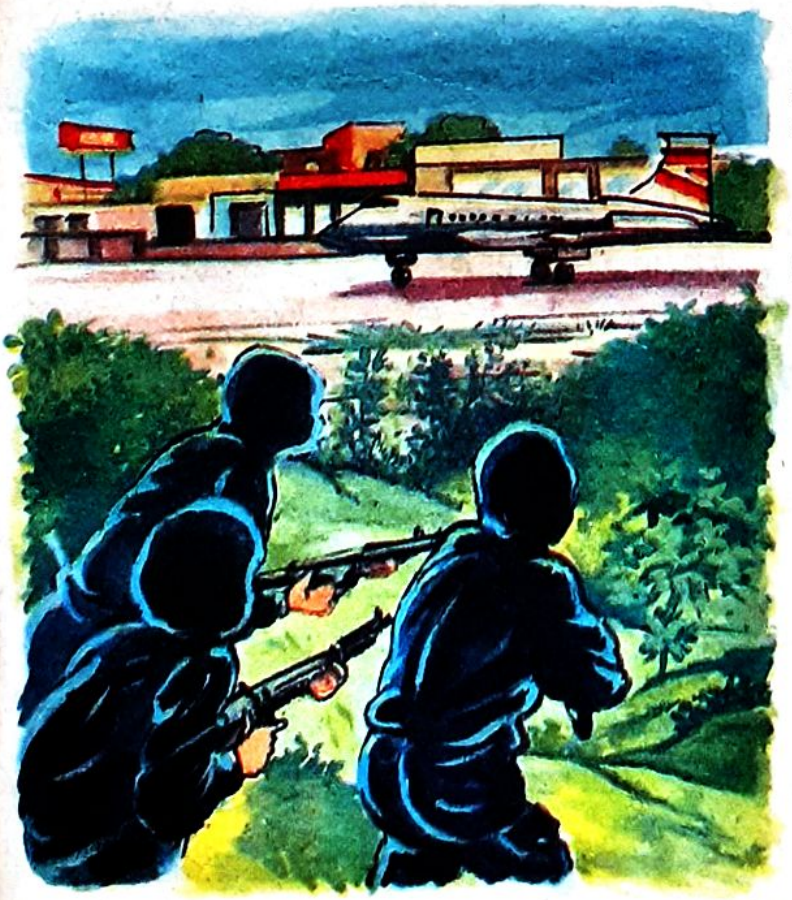

نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور ہم جہاز کی طرف بھاگنے لگے۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف مشن تھا۔ یہ بات کہ یہ میری زندگی کی آخری رات ہو سکتی ہے' میرے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ ٹھیک دو بج کر ستاون منٹ پر ہم جہاز کے پاس تھے۔ ایک اغوا کرنے والا جہاز کے باہر پہرہ دے رہا تھا۔ وہ جب ٹہلتا ہوا اگلے پہیے کی طرف مڑا تو نوید آگے بڑھا اور چیتے کی سی پھرتی سے اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس سے پہلے کہ اسے پتا چلتا' نوید اسے بے ہوش کر چکا تھا۔ اس نے اپنے تھیلے میں سے ایک رسی نکالی اور چند سکنڈوں میں اسے باندھ کر زمین پر پھینک دیا۔ دو بج کر انسٹھ منٹ پر ہم جہاز کے پہیوں کے پاس تھے۔

سب سے پہلے میں پہیوں کے ذریعے اوپر چڑھا۔ چوں کہ صرف ایک اغوا کرنے والا ہی باہر پہرہ دے رہا تھا اس لیے پہیوں کی نگرانی کوئی نہیں کر رہا تھا۔ اندر جا کر میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا خانہ تھا جس کے اندر جہاز کے اڑنے کے بعد پہیے بند ہو جاتے تھے۔ جہاز کے سامان والے حصے میں جانے کے لیے ایک دروازہ تھا جو دوسری جانب سے بند تھا۔ لیکن اسے کھولنے کا بندوبست ہم نے کیا ہوا تھا۔ میں نے ہلکی سی سیٹی بجائی۔ میرے تینوں ساتھی بھی اندر آگئے۔ ہم نے مخصوص آلات کی مدد سے دروازہ کھولا اور جہاز کے اس حصے میں پہنچ گئے جس میں سامان وغیرہ رکھا جاتا ہے۔ اس جگہ بھی کوئی نہیں تھا۔ یہاں سے ہو کر ہم جہاز کے پچھلے حصے میں پہنچے اور جہاز کے مین ہال میں جہاں مسافر بیٹھتے ہیں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔

اسلم نے چاقو نکالا اور اس دروازے میں پھنسا دیا جو جہاز کے مین ہال میں کھلتا تھا۔ ذرا سی زور آزمائی کے بعد تالا ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ ہم چند لمحے ساکت کھڑے رہے اور پھر اسلم نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا۔ پہلی ہی نظر میں اسے تین ہائی جیکر نظر آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں۔ اسلم نے انگلیوں کے اشارے سے ہمیں ہائی جیکروں کی تعداد بتائی۔ میں نے اشارے سے کہا کہ میں' طارق اور اسلم اندر جائیں گے اور نوید یہیں ٹھہر کر ہمارا انتظار کرے۔ اگر خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو پھر وہ اندر جائے گا۔

آگے کا سارا کام ہم نے چند سکنڈوں میں کرنا تھا۔ میں آگے بڑھا اور تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ میرے ساتھی میرے پیچھے تھے۔ میں نے پستول نکال لی تھی۔ جونہی ایک ہائی جیکر کی نظر مجھ پر پڑی اس نے اپنی مشین گن سیدھی کی لیکن اس سے بہت پہلے میری پستول سے گولیاں نکل چکی تھیں۔ دو ہائی جیکروں کے گھٹنے ٹوٹ گئے اور تیسرے کے سینے میں گولی اتر گئی۔ طارق اور اسلم بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھے اور ہائی جیکروں کے ہتھیار چھیننے کے بعد کاک پٹ کی جانب بڑھ گئے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مسافر ٹھیک طور پر سمجھ نہیں پائے کہ کیا ہوا ہے۔ پھر میں تیزی سے آگے بڑھا مگر اسی وقت مجھے پشت کی جانب سے ایک ہلکے کھٹکے کی آواز آئی۔ میری تربیت نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ کسی ہتھیار کی آواز ہے۔ میں اپنی ایڑیوں پر گھوما۔ مسافروں میں سے ایک شخص پستول تانے کھڑا تھا۔ وہ بھی غالباً ہائی جیکر تھا جو مسافر بنا بیٹھا تھا۔ ہم دونوں کے پستولوں سے بیک وقت گولیاں نکلیں اور دونوں اپنے اپنے نشانے پر لگیں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میری چھاتی میں گرم گرم لوہا پرو دیا ہو۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے گرا اور فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔

میری آنکھ ایک ہسپتال میں کھلی۔ میرے سینے سے گولی نکالی جا چکی تھی لیکن میرا دل بری طرح زخمی تھا۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ میرے بچنے کی بہت کم امید ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ طیارہ دشمن ملک نے خود اغوا کروایا تھا تاکہ ہمارے ملک کو بدنام کر سکے لیکن اس کی سازش ناکام ہو گئی"۔

یہ کہانی مجھے میرے والد نے آج سے 6 سال پہلے سنائی تھی۔ وہ اس رات شہید ہو گئے تھے۔ لیکن وہ جتنی دیر کے لیے ہوش میں رہے بالکل ٹھیک معلوم ہوتے تھے۔ اسی دوران میں انہوں نے یہ تمام واقعات مجھے سنائے۔ انہیں اگلے دن کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا مگر وہ آج بھی پوری قوم کے دلوں میں سورج کی طرح چمک رہے ہیں۔

Sharjeel Ahmed

زبیدہ سلطانہ

بے وقوف رحموں

نام تو اس کا رحمت تھا مگر سب اسے رحموں رحموں کہ کر ہی پکارتے تھے۔ یہاں تک کہ اب اسے خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس کا اصلی نام کیا ہے۔ نہ ہی وہ رحمت کہ کر بلانے پر جواب دیتا تھا۔ بیوہ ماں کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ماں نے بہت کوشش کی کہ وہ کچھ پڑھ لکھ لے مگر اس غریب کے سر میں تو جیسے دماغ ہی نہ تھا۔ بہت ہی سیدھا اور کم عقل تھا۔

ایک دن ماں نے کہا کہ قریب کے گاؤں جا کر خالہ کی خیر خبر پوچھ آئے۔ چلتے ہوئے ماں نے تاکید کی کہ "بیٹا! ادھر ادھر گھومنے نہ نکل جانا۔ ناک کی سیدھ خالہ کے گھر ہی جانا"۔

اب رحموں گھر سے نکلا تو ماں کی ہدایت کے موجب ناک کی سیدھ چلا جا رہا تھا۔ راستے میں جو بھی درخت یا کوئی ٹیلا آتا اس کے دائیں بائیں ہو کر نکل جانے کے بجائے اس کے اوپر چڑھ کر دوسری طرف اترتا۔ اتفاق سے راستے میں ایک کنواں آگیا۔ رحموں اسے پھلانگنے کی کوشش میں اندر جا گرا۔ لوگوں نے نکالا تو ایک من چلے نوجوان نے تالی بجا کر کہا "چلو اڑ جاؤ موج کرو!"

رحموں کو یہ بات بہت پسند آئی اور وہ راستے میں تالی بجا بجا کر کہتا چلا جا رہا تھا "چلو اڑ جاؤ موج کرو!" ایک جگہ کسی چڑی مار نے جال لگا رکھا تھا۔ بہت سی چڑیاں اس میں دانے پر آ رہی تھیں کہ رحموں نے زور زور سے تالیاں بجا کر کہا "چلو اڑ جاؤ موج کرو!"

تالی کی آواز سے دانے پر آئی ہوئی ساری چڑیاں اڑ گئیں۔ چڑی مار کو غصہ آیا۔ اس نے رحموں کو پکڑ کر دو چار تھپڑ لگائے۔ رحموں گھگھیانے لگا۔

"جی یہ میں نے تو نہیں کہا۔ وہ تو مجھے کنوئیں سے نکال کر لڑکے نے کہا تھا"۔

چڑی مار کہنے لگا۔ "اچھا چل جا! ایسے نہیں کہتے!"

"جی اور کیا کہتے ہیں؟" رحموں نے پوچھا۔

چڑی مار نے ہنس کر کہا۔ "تم یہ کہتے چلے جاؤ کہ..... آتے جاؤ اور پھنستے جاؤ!"

اب رحموں نے یہی فقرہ رٹنا شروع کیا۔ راستہ بھر یہی فقرہ کہتا گیا۔ "آتے جاؤ پھنستے جاؤ!"

یہی کہتے کہتے وہ ایک قبرستان میں سے گزرا۔ وہاں تین چار چور چوری کا مال آپس میں تقسیم کر رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی رحموں زور سے بولا "آتے جاؤ پھنستے جاؤ! آتے جاؤ اور پھنستے جاؤ!"

چوروں نے اسے پکڑ کر خوب مارا۔ رحموں نے رو کر فریاد کی "جی یہ تو چڑی مار نے کہا تھا کہ یہی کہتے چلے جاؤ۔ اب آپ بتا دیں میں کیا کہوں؟"

چور کہنے لگے "تم یہ کہتے جاؤ کہ "لے لے آؤ دھر دھر جاؤ"

اب رحموں تیز تیز چل کر قبرستان سے نکلا اور یہی دوہراتا ہوا چلا "لے لے آؤ دھر دھر جاؤ! لے لے آؤ دھر دھر جاؤ!"

آگے گیا تو لوگ جنازہ لیے چلے آ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی رحموں زور سے بولا:

"لے لے آؤ دھر دھر جاؤ!"

"ارے! ارے! یہ کیا بکتا ہے؟" لوگوں نے اسے پکڑ کر خوب پٹائی کی۔ رحموں رو کر بولا "جی یہ تو مجھے ان چوروں نے کہا ہے۔ میری کیا مجال کہ میں ایسی بات کہوں"

لوگوں نے پوچھا..... "کہاں ہیں چور؟"

رحموں نے بتایا کہ قبرستان میں چھپے بیٹھے ہیں۔ لوگوں نے جا کر چوروں کو پکڑ لیا جو اسی گاؤں میں چوری کر کے آئے تھے اور رحموں کو چھوڑ دیا نیز یہ کہا کہ تمہیں کہنا چاہیے "ایسا دن کسی پہ نہ آئے۔ ایسا دن کسی پہ نہ آئے"۔

اب رحموں اسی فقرے کا ورد کرتا ہوا چل پڑا۔ آگے گیا تو ایک برات جا رہی تھی۔ جیسے ہی رحموں نے دیکھا تو زور زور سے ہانک لگائی۔ "ایسا دن کسی پہ نہ آئے! ایسا دن کسی پہ نہ آئے!"

براتیوں نے اسے پکڑ لیا اور دو چار تھپڑ رسید کیے "ارے احمق کے بچے یہ کیا بکتا ہے"۔

"جی میں تو نہیں بکتا۔ یہ تو مجھے جنازے والوں نے سکھایا تھا کہ ایسے کہتا چلا جا" رحموں نے رو کر کہا۔ براتیوں کو اس پر ترس آ گیا اور اسے دولہا کے باپ نے کچھ مٹھائی دی اور کہا "لے یہ کھاتا جا اور کہتا "جا ایسا دن سب پر آئے!"

رحموں مٹھائی کھاتے کھاتے یہی کہتا چلا جا رہا تھا کہ ایسا دن سب پر آئے۔ گاؤں میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کسی کے کھیتوں میں آگ لگی ہوئی ہے اور فصل دھڑ دھڑ جل رہی

ہے۔ رحموں لگاتار بول رہا تھا۔ "ایسا وقت سب پر آئے! ایسا وقت سب پر آئے!"

کسانوں نے اسے پکڑ لیا۔ مارنے لگے۔ اس نے دہائی دی "جی یہ میں تو نہیں کہتا' برات والوں نے مجھے سکھایا تھا کہ ایسے کہتے جاؤ"

کسانوں نے بھی اسے مار پیٹ کر چھوڑ دیا۔ آخر کار خالہ کے گھر جا پہنچا۔ اسے یاد آیا کہ ماں نے کہا تھا۔ "خالہ جہاں بھی ہو جا کر اسے سلام کرنا"

رحموں پہنچا تو خالہ اس وقت نہا رہی تھیں۔ اب رحموں نے اپنی ماں کے حکم کے موجب خالہ کو سلام تو کرنا تھا۔ سیدھا منہ اٹھائے غسل خانے میں جا گھسا اور بولا "خالہ سلام"

"ہائے ہائے! تیرا ستیاناس' دفع ہو جا کر باہر بیٹھ۔ اندر کہاں گھس آیا ہے" خالہ خفا ہو کر چلائی تو رحموں ڈر کر باہر بھاگا۔

خالہ نہا کر نکلی تو اس نے خوب پھٹکارا۔ اس پر رحموں بسور کر بولا "لو میں خود تھوڑا آیا ہوں۔ ماں نے ہی کہا تھا خالہ جہاں بیٹھی ہو وہیں جا کر سلام کرنا"۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا "لو اب مجھے معاف کر دو!"

خالہ نے پیار کیا اور کہا "چلو اچھا معاف کیا"

رحموں بولا "ایسے نہیں مجھے یقین آئے گا کہ تم نے مجھے معاف کر دیا' مجھے گھر چھوڑ کر آؤ"

رحموں نے اتنی ضد کی کہ خالہ کو اس کے ساتھ آنا ہی پڑا۔ خالہ کے پاس گھوڑا یکہ تھا' اسی پر بٹھا کر خالہ اسے چھوڑنے اس کے گھر آئی۔ رحموں نے گھر میں گھستے ہی ہانک لگائی "لو ماں! میں خالہ کو لے ہی آیا۔ تم نہ کہتی تھیں کہ خالہ کو ملنے کو جی تڑپ رہا ہے"۔

رحموں نے اپنی حماقت میں بھی خوب چالاکی کی' خالہ کو ساتھ لا کر۔ ایک تو اسے واپسی پر سواری مل گئی دوسرا اس نے ماں کا شوق پورا کر دیا کہ بہن سے ملاقات کرا دی۔ اسی کو کہتے ہیں۔

"دیوانہ بکار خویش ہوشیار!"

یعنی دیوانہ اپنے مطلب کے لیے سیانا ہوتا ہے۔

بچوں کے لیے درس قرآن میں اس بار ہمارا موضوع ہے:

"مایوسی سے بچاؤ"

مایوسی سے بچاؤ کے لیے قرآن حکیم میں متعدد موثر احکام موجود ہیں۔ مثلاً ملاحظہ فرمایئے پارہ نمبر 24' سورہ نمبر 39 کی آیت نمبر 53 کے یہ پانچ الفاظ:

لا تقنطوا من رحمتہ اللہ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو!

بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ خاصی محنت و مشقت کے باوجود بھی انسان کسی کام کاج میں کامیاب نہیں ہوتا۔ ایسے میں مایوسی غلبہ پاسکتی ہے۔ مگر مایوسی ناکامی کا کوئی حل نہیں۔ بلکہ اس سے صورت حال میں مزید شدت' الجھن اور ناکامی کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ کئی بار متعدد سنگین نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں کے خدشے بھی لاحق ہو جاتے ہیں۔

غلطیوں اور گناہوں سے بچنا ضروری ہے مگر کسی لغزش کے بعد پشیمانی اور مایوسی کے چکروں میں الجھ جانا اسلامی انداز حیات کے شایان شان نہیں۔

اسلام میں اللہ تعالیٰ کا تصور ایک ایسی غفور و رحیم ہستی ہے جو اپنے بندوں کی لغزشوں اور گم راہیوں کو بڑی فراخی سے نظر انداز کر دیتی ہے۔ اس لیے بہتر صورت یہی ہے کہ لغزشوں اور غلطیوں سے توبہ کی جائے۔ کسی مقصد میں ناکامی ہو تو دوبارہ کمر ہمت باندھ کر تعمیر و ترقی کے سفر کو پوری شد و مد سے جاری رکھا جائے۔

گم راہیوں' مایوسیوں اور چکروں سے نجات کا موثر ترین طریق اسلامی اصول کی پابندی ہے۔ مثلاً نماز ہی کو لے لیجئے۔ مسجد میں جا کر باجماعت نماز سے مایوسیوں کے بادل چھٹنے لگتے ہیں۔ انسان یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ تنہا نہیں ہے بلکہ لوگوں کے ایک اچھے گروہ کا رکن ہے۔ اسے لوگوں کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے میں ایک گونا گوں لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس میں مسرت' طمانیت اور خود اعتمادی جیسے اعلیٰ اوصاف اجاگر ہوتے ہیں۔ مایوسی کے چکروں سے نجات کی ڈھارس بندھتی ہے اور یوں رفتہ رفتہ وہ ایک بار پھر محنت و مشقت اور تعمیر و ترقی کی روشنیوں سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

ایک سپیرا ایک لٹیرا

Sharjeel Ahmed

ایک سرخ انگارہ تاریک ماحول میں گڑگڑاہٹ کے ساتھ اڑتا چلا جارہا تھا۔ اپنے ڈیرے پر نیم خنک ماحول میں، کمبل میں لپٹ کر لیٹا ہوا شہاب دین اس انگارے کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ کوئی ہوائی جہاز جلتا چلا جارہا ہے۔ پھر یکایک اس جہاز میں سے کوئی چیز گری اور چند لمحوں بعد فضا میں چھتری تن گئی۔ شہاب دین نے بے قراری کے ساتھ کروٹ لی تو اس کی مونج سے بنی ہوئی کھاٹ چرچرا اٹھی۔ وہ بے قرار اس لیے ہوا تھا کہ جہازوں کا جلنا اور ہوائی چھتری کے ذریعے کسی کا نیچے کودنا جنگ کی علامت ہے اور ہر امن پسند شخص جنگ سے نفرت کرتا ہے۔

شہاب دین اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا۔ وہ غور سے اوپر تک رہا تھا۔ کوئی شخص پیرا شوٹ کے ذریعے زمین کی طرف آرہا تھا۔ یہ 1967ء کی نیم خنک رات تھی۔ پاک بھارت جنگ دو سال قبل شروع ہو کر ختم ہو چکی تھی۔ شہاب دین چونک اٹھا۔ ”کیا بھارت نے پھر 1965ء کی طرح چوری چھپے ہماری سرحدوں پر ہلہ بول دیا ہے؟“ اس نے بے اختیار سوچا۔

شہاب دین کے ڈیرے سے چند کھیتوں کے فاصلے پر دھم سے کوئی چیز گری اور اس کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ بھی ابھری۔ شہاب دین کا کتا ”جبڑو“ بھی اس واقعہ کو محسوس کر چکا تھا۔ اس نے بے تکان بھونکنا شروع کر دیا۔

شہاب دین پاک بھارت سرحد کے قریبی گاؤں کا باشندہ تھا اس لیے وہ اپنے ڈیرے پر اپنی بندوق ہر وقت تیار رکھتا تھا کیوں کہ بعض اوقات اسمگلر راہ میں پڑنے والے ڈیرے داروں کو بھی لگے ہاتھوں لوٹ لیا کرتے تھے۔

شہاب دین نے اپنی بندوق سنبھالی اور جبڑو کو پچکار کر اپنے ساتھ لیا۔ جبڑو بہت سمجھ دار کتا تھا، بالکل خاموش ہو کر شہاب دین کے ساتھ چل دیا۔ ان دونوں نے جب دبے قدموں تیسرا کھیت عبور کیا تو انہیں آہٹ سنائی دی۔ شہاب دین اس آہٹ پر متوجہ ہوا اور جبڑو نے حملہ کرنے کا جارحانہ انداز اپنا لیا۔ جبڑو شہاب دین کے ساتھ اکثر رات کے وقت شکار پر جانے کی وجہ سے تربیت حاصل کر چکا تھا۔

پانی کے خشک کھال میں کوئی آہستہ آہستہ چلا آرہا تھا۔ شہاب دین نے آنے والے پر طاقت ور ٹارچ روشن کر دی۔ نامانوس اجنبی روشنی میں نہا گیا۔ شہاب دین نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ بھارتی فضائیہ کا ہوا باز تھا۔ 1965ء میں اس کے گاؤں کے لوگوں نے ایک بھارتی ہوا باز پکڑا تھا۔ شہاب دین کو وہی وردی یاد آگئی تھی۔ جبڑو بے چین ہو کر اس اجنبی پر پل پڑنے کو تیار تھا مگر اس کے مالک نے اسے ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ اجنبی کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

”تم تو بھارتی پائلٹ ہو“ شہاب دین نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

اجنبی کا چہرہ ایسے تھا جیسے کسی نے اس کا بالٹی بھر خون نچوڑ لیا ہو۔ اس نے مردہ انداز میں سر ہلا کر اقرار کیا پھر نہایت نقاہت بھری آواز سے کہا "سانپ" یہ کہ کر وہ چپ ہو گیا۔

"کہاں ہے سانپ؟" شہاب دین آگے بڑھا۔

"مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے" بھارتی ہوا باز نے اپنی بات کی تشریح کی۔

"کہاں پر ڈسا ہے؟"

"ٹانگ پر"

"فوراً لیٹ جاؤ" شہاب دین نے کہا۔

بھارتی ہوا باز کھال میں ہی لیٹ گیا۔ شہاب دین نے آگے بڑھ کر اس کی متاثرہ ٹانگ کا معاینہ کیا۔ سانپ نے اس کی پنڈلی پر ڈسا تھا۔ شہاب دین نے ہوا باز کے سینے پر آویزاں بلا اتارا اور اس کی سوئی لے کر ہوا باز کی پنڈلی کو اس جگہ سے گود ڈالا جہاں سانپ نے ڈسا تھا۔ اس کے بعد شہاب دین نے متاثرہ حصے پر منہ لگا کر خون چوسا اور اس زہر آلود خون کو زمین پر تھوک دیا۔ یہ عمل اس نے بار بار دہرایا۔ بھارتی ہوا باز نے اپنی پنڈلی پر اپنا لباس پھاڑ کر باندھا ہوا تھا۔ شہاب دین نے اس پٹی کو اور کس کر باندھ دیا اور پھر آخری بار منہ لگا کر خوب خون چوسا اور اسے بھی تھوک دیا۔

"سانپ کیسا تھا؟" اس نے ہوا باز سے پوچھا۔

"اپنے باپ جیسا ہی ہو گا' میں نے کب اس پاپی کو دیکھا ہے' بس ذرا جھلک دکھا کر سرسراتا ہوا نکل گیا تھا" ہوا باز نے کراہ کر جواب دیا۔

"لگتا ہے تیری حالت سنبھل رہی ہے۔ اسی لیے تو تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔ خیر' تم یہیں چپکے لیٹے رہو میں دوائیں لاتا ہوں" شہاب دین یہ کہ کر دوڑ گیا۔ جبڑو بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

"ہائے کم بخت کہیں گاؤں والوں کو نہ بلا لائے ..... ہائے"

بھارتی ہوا باز نے اپنے ہم درد کے متعلق اپنا خیال بڑبڑا کر ظاہر کیا اور پھر سرس کے بلند و بالا درخت کو تکنے لگا۔

شہاب دین جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا جگ بھی تھا۔ اس نے جیب سے دو گولیاں نکال کر ہوا باز کو دیں اور پھر پانی کا جگ بھی اسے تھما دیا۔ وہ گولیاں پھانک کر غٹا غٹ پانی پی گیا۔ شہاب دین نے اپنے نیفے میں سے ایک ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر اس کی پنڈلی پر مرہم لگا دیا۔ مرہم لگتے ہی ہوا باز کو سکون سا آگیا۔ اس نے پوچھا "چاچا! آپ کا نام کیا ہے؟"

"شہاب دین..... اور تیرا کیا نام ہے جوان!"

"تندولکر"

فوج کا درجہ؟

"سینئر فلائنگ اوفیسر"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"جالندھر کا"

"بے گناہ شہریوں پر بم گراتے ہو..... مگر کیوں؟"

تندولکر خاموش ہو گیا۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولا "میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میرا جہاز بھٹک کر پاکستان آنکلا تھا۔ طیارہ شکن توپ نے اسے نشانہ بنایا اور اس کی دم بری طرح جل اٹھی۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی میں کود نکلا۔ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں مجھے پولیس یا فوج کے حوالے نہ کریں' میں بے گناہ ہوں"۔

"آج سے چند سال قبل میرا ہوا باز بیٹا راشد سرحدی علاقے کے پاس پاکستان کی فضائی حدود میں چھوٹے جہاز پر سوار ہو کر تربیتی مشق کر رہا تھا۔ بھارتی جنگی طیاروں نے بین الاقوامی فضائی قوانین کی سخت خلاف ورزی کر کے پاکستان کی حد میں تین کلو میٹر آگے بڑھ کر اس کے جہاز کو نشانہ بنایا۔ وہ شہید ہو گیا تھا۔ میرا دلیر بیٹا" شہاب دین کی آواز فرط جذبات سے رندھ گئی۔

"مگر اس جرم میں تو میں بے قصور ہوں۔ بھگوان گواہ ہے کہ میں پچھلے برس ہی بمبئی سے جالندھر تبادلہ کروا کر آیا ہوں"

"میرا دوسرا بیٹا بھی ہوا باز بن چکا ہے۔ وہ آج کل چکالہ ائیر بیس میں متعین ہے۔ بھارتی فوج اسے بھی ہمارے

ملک میں گھس کر نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرے گی"

"چاچا آپ یقین کریں میں آپ کے راشد کا قاتل نہیں ہوں"۔

شہاب دین تندولکر کو اپنی پشت پر لاد کر اپنے ڈیرے تک لے گیا۔ تندولکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے فکر مند ہو کر پوچھا "اب تو میں بچ جاؤں گا نا؟"

"سانپ بہت زہریلا تھا۔ تم آدھ پہر میں مر سکتے تھے البتہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ تمہیں سانپ نے کیسے ڈس لیا؟ تم تو چھتری کے ساتھ نیچے اترے تھے"

"میں بانس کے پودوں کے قریب اترا تھا" تندولکر نے جواب دیا "میں بانس کے خشک پتوں پر بیٹھ کر خود کو پیراشوٹ کی بندشوں سے آزاد کر رہا تھا کہ سانپ نے مجھے ڈس لیا۔ مگر آپ مجھے کافی تجربہ کار سپیرے لگتے ہیں؟"

"میں پیشے کے لحاظ سے کسان ہوں۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں ہمارے گاؤں میں ایک سپیرا رہتا تھا۔ لڑکپن میں مجھے بھی سانپوں سے لگاؤ ہو گیا اور میں نے اس سپیرے سے رفتہ رفتہ یہ کام سیکھ لیا۔ اب میں ہر برس سانپ پکڑتا ہوں اور سانپوں کے ڈسے ہوئے لوگ مجھ سے دوا بھی لینے آتے ہیں"۔

"آپ یہ مرہم اور گولیاں کس چیز سے بناتے ہیں؟ یہ بہت سکون آور ہیں" بھارتی ہوا باز نے پوچھا۔

"ان میں بہت کچھ ڈالا جاتا ہے۔ تخم کا ہو، گولر کے پھول، گول مرچ، گوگل اور....."

"گول گپا" تندولکر نے ہنس کر کہا۔

شہاب دین نے اس سخت ماحول میں بھی تندولکر کو ہنستے ہوئے دیکھا تو اسے اپنا شہید بیٹا یاد آ گیا۔ وہ بھی غم و درد میں بے اختیار ہنس دیا کرتا تھا۔ راشد کو یاد کر کے اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ بے شک شہید زندہ ہوتے ہیں مگر بیٹا دوسرے شہر میں بھی ہو تو باپ کا دل اس کے لیے بے قرار رہتا ہے جب کہ راشد سے ملنے کے لیے اسے ابھی قیامت تک کا لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ شہاب دین نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے شہید بیٹے کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کی۔

"چاچا! کیا سارے سانپ زہریلے ہوتے ہیں؟" تندولکر نے پوچھا۔

"نہیں..... کچھ سانپ کے ڈسے افراد محض خوف سے بھی مر جاتے ہیں کہ انہیں سانپ نے ڈس لیا ہے۔ کم حوصلہ لوگوں کا اس خوف سے دل رک جاتا ہے"۔

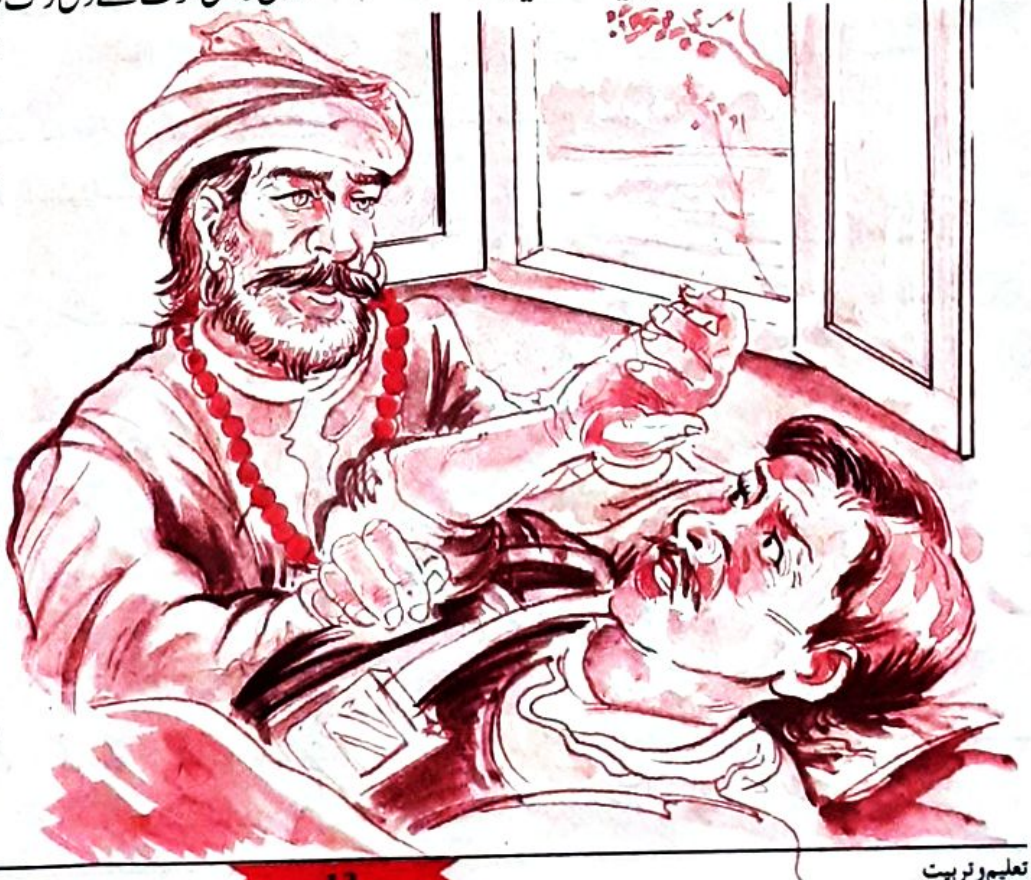

"میرا جہاز ہوا میں ہی پھٹ گیا تھا مگر مجھے پولیس اور فوج ضرور ڈھونڈے گی۔ کئی لوگوں نے مجھے جہاز سے نیچے کودتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ آپ صبح میرا پیراشوٹ فوج کے حوالے کر دیں اور میرے بارے لاعلمی ظاہر کریں چاچا جی!"

"تم کوئی فکر نہ کرو بچڑا..... میں کسی اور باپ کا دل دکھنے نہیں دوں گا"

آہستہ آہستہ باقی ماندہ رات بھی ڈھل گئی۔ فجر کی اذان کے

وقت شہاب دین نے اپنی بھینس کا دودھ دھویا اور پھر سیر بھر دودھ اسے بھی گرم کر کے پینے کو دیا۔ شہاب دین اپنے گھر دودھ دینے اور مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ واپس اپنے ڈیرے پر پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں میٹھی چھاچھ سے بھرا ڈول تھا اور دوسرے ہاتھ میں کپڑے تھے۔ اس نے وہ کپڑے تندولکر کو پہنائے اور اس کی وردی جلا کر تلف کر دی۔ پھر وہ پیراشوٹ سمیٹ کر گاؤں چلا گیا۔ گاؤں کے نمبر دار نے پولیس سے رابطہ کیا اور پیراشوٹ پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ جب کہ فوج مسلسل بھارتی ہواباز کو ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ جل دے کر کہاں نکل گیا ہے۔ دوپہر کے وقت شہاب دین نے اسے میٹھی چھاچھ کے ساتھ تریاق گولیاں کھلائیں تاکہ زہر کا باقی ماندہ اثر بھی زائل ہو جائے۔ شام کے وقت شہاب دین بانسوں کے جھنڈ میں سے وہ سانپ پکڑ لایا جس نے بھارتی ہوا باز پر وار کیا تھا۔

"چاچا! اسے مار ڈالیں، اس کا سر کچل دیں" تندولکر نے کہا۔

شہاب دین نے سانپ کو ایک پٹاری میں بند کرتے ہوئے کہا "میں سپیرا ہوں سانپ کو مارتا نہیں بلکہ پکڑتا ہوں پھر اس کا زہر نکال کر اسے بے ضرر بنا ڈالتا ہوں"۔

"میں نے سن رکھا ہے کہ سانپ کبھی کسی کا دوست نہیں بنتا اور دودھ پی کر دودھ پلانے والے کو ہی ڈس لیتا ہے" تندولکر نے کہا۔

"ہاں یہ بات سو فی صد درست ہے" شہاب دین نے تصدیق کی۔

تندولکر اس ڈیرے میں تین روز چھپا رہا اور دودھ بالائی کھاتا رہا۔ تیسرے دن کا اختتام ہوا۔ سورج غروب ہونے کو تھا کہ تندولکر نے واپسی کی ٹھانی۔ شہاب دین نے اسے سرحد کی طرف جانے کا راستہ سمجھا دیا۔

ایک مجبور انسان کے طور پر تجھے تحفظ فراہم کیا ہے۔ میں نے تیرا علاج کیا، تیری کمزوری رفع کرنے کے لیے تجھے دودھ مکھن چٹایا، اب میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم ساری زندگی انسانیت کا دلی احترام کرتے رہو گے اور بے جا قتل و غارت سے پرہیز کرو گے۔ کسی بے گناہ کا خون نہیں بہاؤ گے۔ شہری آبادی پر بم نہیں گراؤ گے"

"چاچا! میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ساری زندگی انسان دوست بن کر رہوں گا" تندولکر نے عہد کیا۔

تندولکر وہاں سے چلا گیا۔ دن گزرتے گئے۔ وقت رواں رہا۔ اگلے ماہ بھارت سے ایک خط شہاب دین کے نام آیا۔ خط میں لکھا تھا۔

جالندھر (بھارت) یکم پوس 2024 بکرمی

چاچا شہاب دین! نمستے

میں اگرچہ پاکستان میں بم باری کرنے گیا تھا مگر آپ کی مدد اور بھگوان کی کرپا سے میں اپنے دیش بخیریت پہنچ گیا۔ جب میں گھر پہنچا تو پتا جی بیمار تھے۔ انہوں نے آپ کو یاد فرمایا تھا۔ چند روز قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے کریا کرم کے بعد میں آپ کو ان کی وصیت کے مطابق یہ پریم پتر لکھنے بیٹھا ہوں۔

آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پاکستان کی فضائی حدود میں گھس کر پاکستانی طیارے پر پہلا راکٹ میں نے ہی مارا تھا۔ آئندہ زندگی میں بھی میں پاکستانیوں کی ہر ممکن سیوا کروں گا۔ کیوں کہ میں نے پاکستان میں رہ کر آپ کے ہاتھوں کا نمک کھایا ہے۔ اجازت دیجیے۔ نمسکار

فقط تندولکر

وہ گندا خط شہاب دین کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ خط اڑتا ہوا ایک گندی نالی میں جا پڑا۔ گندی چیز گندی جگہ پہنچ چکی تھی۔ شہاب دین کی گھنی ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔ وہ سانپ پکڑ لیتا تھا مگر ایک بہت خطرناک سانپ اس کے ہاتھوں دودھ پی کر دور جا چکا تھا اور اب دور سے پھنکار رہا تھا۔ شہاب دین کا واسطہ اپنی زندگی میں طرح طرح کے خطرناک سانپوں سے پڑا تھا مگر تندولکر سب سے خطرناک سانپ نکلا تھا۔ سانپ دودھ پی کر دودھ پلانے والے کو ڈستا ہے مگر کچھ سانپ بہت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ دودھ پیتے پیتے اچانک منہ اٹھا کر دودھ پلانے والے کو ڈس لیتے ہیں اور پھر

مزے سے باقی ماندہ دودھ پیتے ہیں۔ تندولکر بھی ایسا ہی خطرناک سانپ تھا۔

چند ماہ بعد شہاب دین نے اپنے چھوٹے ہوا باز بیٹے ساجد کی شادی کی۔ ساجد ایک روز اپنی بیوی کے ساتھ شہر گیا تو وہاں سے ایک بہت بڑا ریڈیو لایا۔ اس نے وہ ریڈیو اپنے والد کے حوالے کر دیا۔ وہ کم و بیش چھ سیر وزن کا ریڈیو تھا۔ شہاب دین وہ ریڈیو اپنے زرعی ڈیرے پر لے گیا۔ وہ اس پر خبریں سنتا تھا۔ دو سال بعد خبروں میں مشرقی پاکستان کی شدید گڑبڑ کا ذکر بار بار شروع ہو گیا۔

1947ء میں جب برصغیر پاک و ہند کو تقسیم کیا گیا تو پاکستان کے دو حصے بنے' ایک مشرقی پاکستان اور دوسرا حصہ مغربی پاکستان پر مشتمل تھا مگر دشمن کو تو کوئی حصہ بھی گوارا نہیں تھا۔ اس لیے بھارت نے پاکستان پر جلد ہی حملہ کر دیا۔

1965ء میں بھارت نے 6 ستمبر کی اندھیری رات میں دوبارہ بزدلانہ حملہ کیا۔ بھارتی فوجی افسران نے اپنے فوجیوں کو یقین دلا رکھا تھا کہ ہم کل دوپہر کا کھانا لاہور میں کھائیں گے اور راتوں رات ہی پاکستان کو فتح کر لیں گے۔ بھارتی فوج لاہور میں ڈٹ کر کھانا تو نہ کھا سکی البتہ ڈٹ کر مار کھاتی ہوئی لوٹ گئی۔ قوم اور فوج نے مل کر بزدلوں کو مار بھگایا۔ ادھر مار کھاتے ہوئے بھارتی جوان اپنی پشتیں سہلا رہے تھے اور ادھر دنیا کا ایک بہت بڑا نشریاتی ادارہ یہ خبر نشر کر رہا تھا کہ لاہور کو فتح کر لیا گیا ہے۔ دراصل یہ افواہ بھارت کی ہی اڑائی ہوئی تھی۔ اس نازک وقت میں ریڈیو پاکستان نے بھرپور کردار ادا کر کے دشمن کے ناپاک ہتھکنڈوں کو نام بنایا۔

1965ء میں دانت کھٹے ہونے کے بعد بھارت نے مشرقی پاکستان میں اپنی روایتی سازشوں کو خوب بڑھا دیا۔ وہاں کے مدرسوں میں بہت سے ہندو استاد پڑھاتے تھے۔ وہ نوجوان نسل کے ذہنوں میں یہ زہر گھولتے تھے کہ مغربی پاکستان تمہارا سرمایہ کھاتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی گماشتوں نے وہاں زبان کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کو بتایا گیا کہ اردو تمہاری قومی زبان نہیں بلکہ صرف اور صرف بنگلہ زبان میں ہی تمہاری نجات ہے۔ عوام اس سازش کو سمجھ نہ پائے اور مشتعل ہو کر مظاہرے کرنے لگے اور ہر طرف ہنگامے شروع ہو گئے۔ حال آں کہ اردو ہی وہ واحد زبان ہے جو پاکستان کے تمام صوبوں میں 'سمجھی' 'بولی' 'لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ یہ ایک رابطہ پل ہے مگر دشمن نے اس پر بھرپور وار کیا۔

بھارت نے غنڈوں پر مشتمل ایک تنظیم "مکتی باہنی" بنگال میں بنوائی اور ان غنڈوں کو بھارت میں لے جا کر لڑائی بھڑائی کی تربیت دیتا رہا۔ آخر کار 1971ء میں یہ آگ پوری طرح بھڑک اٹھی۔ پاکستان کو تیسری جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ شہاب دین کے ہوا باز بیٹے ساجد کو کراچی جا کر سمندری سرحدوں کی حفاظت کرنے کا حکم ملا۔ بحری فوج میں بھی جہاز اور ہیلی کاپٹر ہوتے ہیں۔ پاک بحریہ کے ہوا باز مشرقی پاکستان چلے گئے۔ لہٰذا پاکستانی فضائیہ کے کچھ ہوا باز کراچی بھیج دیئے گئے تاکہ وہ جہازوں سے سمندری سرحدوں کی حفاظت کریں۔ ایک روز ساجد پاک بحریہ کے دس جوانوں کو لے کر ایک بحری جہاز تک پہنچانے کے لیے سمندر پر سے گزر رہا تھا کہ حیدر آباد (بھارت) کی طرف سے آنے والے ایک جنگی جہاز نے دور سے ہی اس کے جہاز پر میزائل داغ دیا۔ سب جوانوں نے شہادت کا رتبہ پایا۔ واضح رہے کہ ساجد پاکستانی سمندری علاقے میں محو پرواز تھا اور یہ علاقہ محاذ سے بہت دور تھا۔

شہاب دین نے دعا کی "اللہ! میرے دو ہی بیٹے تھے۔ وہ دونوں تیری راہ میں کام آئے۔ مجھے دو سو بیٹے دے دے تاکہ وہ بھی تیری راہ میں کام آئیں"۔

آخر کار بھارت کی جنگی سازش' پاکستانی حکمرانوں کی بے پروائی اور بنگالی عوام کی جلد بازی سے مشرقی پاکستان ہم سے کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ بھارت نے بہت عیاری سے کام لے کر وہاں پر موجود پاکستانی فوج کے جوانوں کو قید کر لیا اور پھر بھارت کی جیلوں میں ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ حال آں کہ ساری دنیا میں کہیں بھی جنگی قیدی کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا جاتا۔ بھارت انہیں چونا ملا کر روٹیاں کھلاتا رہا اور ان کے سالن میں پسا ہوا شیشہ ملاتا رہا اور یوں وہ شیر جوان ناکارہ

ہوتے چلے گئے۔

شہاب دین ایک روز شام کے وقت اپنے ڈیرے پر لیٹ کر ریڈیو پر خبریں سن رہا تھا کہ اس نے بینڈ کی سوئی گھمادی۔ آل انڈیا ریڈیو پر کوئی خاتون کہہ رہی تھی "کموڈور تندولکر نے پاکستانی سمندری سرحد میں گھس کر طیارے پی 33 کو نشانہ بنایا اور اعلیٰ جرات کا مظاہرہ کیا تھا۔ لہٰذا اسے بھارتی فضائیہ کے ائیر مارشل سی آر داس نے ائیر کموڈور بنادیا ہے نیز بھارت سرکار نے اس بہادر ہواباز کو مماویر چکر (پاکستان کے ہلال جرات کے مساوی اعزاز) بھی بخشا ہے۔ اس موقع پر ائیر کموڈور تندولکر نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ وہ دوبار پاکستانی طیاروں کو نشانہ بنا چکا ہے اور آئندہ بھی بناتا رہے گا"۔

شہاب دین ٹوٹ کر رہ گیا۔ اسے اچھی طرح پتا تھا کہ ساجد پی 33 ہی اڑا رہا تھا۔ اس نے کراچی سے جو تصویر بھیجی تھی اس میں وہ پی 33 کے عین قریب کھڑا تھا۔ یہ تصویر اس کی اچھی ہوابازی کے موقع پر سند دیتے وقت اتاری گئی تھی۔ تو گویا تندولکر نے شہاب دین کے احسان کا بدلہ یوں اتارا تھا۔

تقریباً دو سال بعد بھارت سے پاکستانی فوجیوں کا لٹا پٹا قافلہ پاکستان آیا تو کوئی فوجی لنگڑا کر چل رہا تھا۔ کسی کی بینائی کم زور ہو چکی تھی۔ زیادہ تر جوان ناقص غذا کی وجہ سے آنتوں کے امراض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ دراصل پاکستان نے 1971ء میں شکست نہیں کھائی تھی بلکہ بہت بڑا دھوکا کھایا تھا۔ ملک کے ملٹری ہسپتال ان بیمار جوانوں سے بھر گئے تھے۔ شہاب دین گاؤں سے اکثر جوانوں کے لیے دودھ لے کر جاتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ سب قوم کے جری سپوت ہیں۔ یہ تو شیر ہیں بس لومڑ کے لگائے ہوئے پھندے میں پھنس کر گر پڑے تھے۔

ایک روز شہاب دین شہر کی طرف اپنے دو بیل لے کر جارہا تھا۔ شہر میں مواشی منڈی چند روز کے لیے لگی ہوئی تھی۔ وہ انہیں وہاں فروخت کر کے تازہ دم بچھڑے خریدنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ وہ اب خاصے بوڑھے ہو گئے تھے۔ دس کوس کا فاصلہ طے کر کے وہ ستانے کے لیے اپنے بیل ایک درخت کے ساتھ باندھ کر سرسبز گھاس پر لیٹ گیا۔ جبڑو حسب معمول اس کے ساتھ ہی تھا۔ اچانک وہ حیران ہو گیا۔ دور آسمان پر سے کوئی بہت بڑی چیز نیچے کی طرف آرہی تھی اور تھی بھی بالکل سیدھی۔ چند لمحوں بعد راز بھی کھل گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز تھا جس کے دونوں بازو آدھے سے زیادہ کٹ چکے تھے اور باقی ماندہ سلگ رہے تھے۔ وہ جہاز کٹے ہوئے شہتیر کی طرح عین سر کے بل سیدھا نیچے آرہا تھا۔ پھر اس میں سے کوئی کود کر باہر نکلا اور ایک ہوائی چھتری تن گئی۔ وہ جہاز شہاب دین سے کوئی بارہ کھیت دور گرا اور پھر ایک دھماکے کے ساتھ اس میں آگ لگ گئی۔ البتہ وہ چھتری والا ہواباز اس کے قریب ہی اترا۔ اس سے پہلے کہ وہ پیراشوٹ کے بندھن سے آزاد ہوتا شہاب دین نے اپنی مضبوط ڈانگ سے اس ہواباز کی کمر پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ چکرا کر نیچے گر پڑا۔ شہاب دین نے طنز سے کہا "شانت رہیے مہاراج" "دھیرج مہاراج دھیرج"

اس ہواباز کی آنکھوں میں سارے زمانے کا خوف سمٹ آیا۔ وہ ملعون تندولکر ہی تھا۔ اس نے پیراشوٹ کا ایک بندھن کھولتے ہوئے کہا "بابا! میری مدد کرو۔ میں پاکستانی ہواباز ہوں' محمد عالم"

مگر باباجی کی یادداشت کم زور نہیں تھی۔

شہاب دین نے کہا "آج تو نے وردی نہیں پہنی' کلغی والے سانپ!"

تندولکر نے فوراً پیراشوٹ کا اپنے بدن سے بندھا ہوا دوسرا بندھن بھی کھول دیا مگر وہ ابھی بھاگنے دوڑنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی کمر ابھی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھی۔ ادھر شہاب دین کی حالت بگڑ رہی تھی۔ اس کے سامنے بارہ بے گناہ پاکستانیوں کا قاتل موجود تھا جن میں اس کے دو لاڈلے بیٹے بھی شامل تھے۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ اس نے بے تاب ہو کر دشمن کے سر پر وار کرنے کے لیے اپنی ڈانگ بلند کی مگر پھر کچھ سوچ کر پرے پھینک دی۔ اس نے تندولکر کو گردن سے پکڑ کر قابو کر لیا۔ اس نے اس کا نرخرہ دبایا تو تندولکر کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔ شہاب دین نے کہا "میں سپیرا ہوں اور تو دودھ پی کر بار

بار ڈسنے والا سانپ ہے۔ دیکھ میں اس طرح سانپ کو قابو کیا کرتا ہوں۔ تجھے یاد ہو گا میں نے کہا تھا کہ میں سانپ کو مارتا نہیں پکڑتا ہوں۔ تو ابھی پاکستانی فوج کے لیے بہت کار آمد ہے۔ تیرے سینے میں معلومات کا زہر ہے۔ وہ ابھی نچوڑا جائے گا..... تندولکر! دیکھ میں سپیرا ہوں' سانپ پکڑتا ہوں اور تو لٹیرا ہے تو امن لوٹتا ہے' خون بہاتا ہے۔ سچ سچ بتا تیرا اب یہاں آنے کا کیا مقصد تھا؟"

تندولکر گھٹی گھٹی آواز میں بولا "بھارت نے روس سے جاسوسی طیارے خریدے ہیں جو اتنے بلند پرواز ہوتے ہیں کہ عام دوربین سے نظر نہیں آتے۔ میں پاکستان کی جاسوسی کرنے ہی آیا تھا مگر پاکستان اپنے دفاع سے غافل نہیں۔ میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنی بلندی پر رے ڈار دیکھ پائے گا مگر اچانک دو جہاز نمودار ہوئے اور انہوں نے میرے جہاز کے دونوں پر بے کار کر دیئے اور جہاز پتھر کی طرح نیچے آرہا۔ ایسی حالت میں جہاز سے میں بہت دقت کے ساتھ باہر کودا"۔

شہاب دین نے کہا "سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے مگر بھارت زہریلے سانپوں کے معاملے میں بہت خود کفیل ہے۔ آج میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور خطرناک سانپ پکڑا ہے۔ چل تجھے فروخت کروں۔ مگر میں اتنی بڑی پٹاری کہاں سے لاؤں؟"

"مگر اب تو دونوں ملکوں کے حالات سدھر گئے ہیں۔ جنگی قیدی بھی رہا ہو گئے ہیں" تندولکر نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ شہاب دین کے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔

"جی ہاں' جنگی قیدی جو دھوکے سے قید کئے گئے تھے واپس آئے تو کسی کے پاؤں میں جوتا تھا نہ کسی کے سر پر کپڑا۔ آپ کی مہمان نوازی کے بعد وہ کسی قابل نہیں رہے۔ چل میں تجھے اپنی بین پر نچاؤ"

شہاب دین نے جبڑو کو اشارہ کیا۔ وہ بھی اسے قابو کرنے پر تل گیا۔ شہاب دین نے بیلوں کے ساتھ اسے بھی باندھا اور شہر لے گیا۔ اس نے بیل منڈی میں فروخت کئے اور اس بڑے سانپ کو فوج کے حوالے کر کے بہت بڑا انعام وصول کیا۔ اس انعامی رقم سے شہاب دین نے ڈھیروں پھل خرید کر ملٹری ہسپتال کا رخ کیا جہاں بھارت سے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت کر آنے والے بہت سے جوان زیر علاج تھے۔ البتہ اس ائیر کموڈور کی پاک فوج نے "ائیر" نکال کر اسے جلد ہی کموڈور سے کموڈ بنا ڈالا۔

عذر قبول کیا جائے

زاہدہ پروین

سحر نے بہت بے چینی سے ایک دفعہ پھر گھڑی کو دیکھا اور نظریں گیٹ پر جمادیں۔ اسکول لگنے میں صرف 5 منٹ ہی رہ گئے تھے اور ابھی تک مومنہ کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں اور مومنہ کے جلد آنے کی دعا کی لیکن..... وہ 5 منٹ بھی گزر گئے اور گھنٹی کی آواز پر وہ مردہ قدموں سے اسمبلی گراؤنڈ کی طرف چل دی۔ ''اف اب کیا ہوگا؟'' اس کے ذہن میں بار بار یہی سوال گونج رہا تھا۔

اسمبلی کے دوران میں بھی وہ خالی الذہن کھڑی رہی۔ اس کے سامنے کل کا واقعہ گھوم رہا تھا۔

''سحر پلیز! مجھے تم سے ایک کام ہے'' تفریح کے وقفے میں مومنہ نے اس سے کہا تھا۔

''کس قسم کا کام؟'' وہ مسکرائی۔

''تمہیں تو پتا ہے پچھلے ہفتے دادا جان کی وفات کی وجہ سے ہمیں گاؤں جانا پڑ گیا تھا اس لیے میں کافی دن اسکول نہیں آسکی۔ میں چاہ رہی تھی کہ آج تم حساب اور سائنس کی کاپی مجھے دے دو تاکہ میں پچھلا کام اتار سکوں''۔

اور سحر نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد جلدی واپس کرنے کی تاکید کے ساتھ دونوں کاپیاں اسے تھما دی تھیں اور آج..... آج مومنہ آئی ہی نہیں تھی، غصہ آنا تو فطری بات تھی۔ ''کل مومنہ آئے گی تو خوب لڑوں گی'' اس نے فیصلہ کیا۔

''السلام علیکم سحر، یہ تمہاری کاپیاں..... میں تو کل ہی'' اگلے دن مومنہ نے اس کی کاپیاں اسے واپس کرتے ہوئے صفائی پیش کرنا چاہی لیکن اس نے مومنہ کی پوری بات سنے بغیر ہی کاپیاں جھپٹیں اور یہ جا وہ جا۔ اس کا عذر سننے کی بھی زحمت نہیں کی۔

اب سحر نے کاپیوں کی جو حالت دیکھی تو اسے مزید غصہ آیا۔ ان کا کور جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا اور جلد اکھڑنے کے قریب تھی۔ ایک دو صفحات پر مٹی کے نشان بھی تھے۔

''نجانے یہ میری کاپیوں کے ساتھ کیا کیا کرتی رہی ہے۔ ہونہہ، آئندہ اسے کوئی چیز نہیں دوں گی'' اس نے فیصلہ کیا۔

اسی وقت مومنہ دوبارہ اس کے پاس آئی ''سحر پلیز میری بات تو سنو''۔

''بولو!'' اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔ ''اب یہ ضرور کوئی بہانہ بنائے گی'' اس نے سوچا۔

"پرسوں شام کو میں نے تمہاری کاپیاں اپنے چھوٹے بھائی کو دی تھیں کہ تمہیں واپس کر آئے۔ وہ بائی سکل پر تمہاری طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اس کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا اور بہت سی چوٹوں کے علاوہ دایاں بازو بھی ٹوٹ گیا ہے۔ امی تو ابھی تک گاؤں سے نہیں آئی تھیں اس لیے مجھے کل چھٹی کرنی پڑی۔ امی کل شام کو ہی پہنچی ہیں اس لیے میں آج اسکول آئی ہوں۔ ان حالات میں مجھے ذرا فرصت نہیں ملی کہ تمہاری کاپیوں کی حالت ہی درست کر دیتی۔ پلیز مجھے معاف کر دو"۔

سحر نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور کچھ بولے بغیر وہاں سے اٹھ آئی۔ وہ پورا دن اس نے مومنہ سے کوئی بات نہیں کی حال آں کہ اس سے اس کی بہت دوستی تھی۔

دن گزرتے گئے' یہ واقعہ ماضی کی گرد میں دب گیا۔ پھر یہ ہوا کہ بدلتے موسم نے جہاں اور بہت سے بچوں کو بیماری کا تحفہ دیا وہاں سحر کو بھی شدید بخار اور کھانسی نے آگھیرا۔ دو دن اسکول سے چھٹی کی' کڑوی کڑوی دوا پینی پڑی۔ تیسرے دن طبیعت سنبھلی تو امی نے اسکول بھیجا اور ایک دو دن میں وہ پوری طرح صحت یاب ہو گئی۔

اس دن کلاس میں مس نے اطلاع دی کہ پرسوں سائنس کا ٹسٹ ہو گا تو ایک دم سحر کو یاد آیا کہ بیماری کے دنوں میں جو چھٹیاں کی تھیں تو سائنس کے کچھ نوٹس لکھنے سے رہ گئے تھے۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر ساتھ بیٹھی مومنہ نے وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا تو مومنہ نے بغیر کچھ کہے اپنی سائنس کی کاپی نکال کر اسے دے دی۔

"یہ لو اتنی سی بات پر پریشان ہو رہی تھی۔ تسلی سے نوٹس اتارو۔ کل واپس کر دینا' ٹسٹ تو پرسوں ہے نا"

سحر نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کاپی بیگ میں رکھ لی۔ سحر گھر پہنچی تو خالہ جان اپنے تین عدد شرارتی بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں۔ سحر نے بستہ کمرے میں رکھا اور خالہ جان سے گپ شپ کرنے لگی۔ جب کہ ان کے بچے اسد اور حمزہ کے ساتھ مل کر پورے گھر میں اودھم مچا رہے تھے۔ وہ تو شاید شام تک خالہ جان سے باتیں ہی کرتی رہتی اگر امی کھانے کے لیے آواز نہ دیتیں۔

"اچھا امی میں یونی فارم بدل کر آتی ہوں" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی لیکن دروازے میں ہی ٹھٹک گئی "یا خدایا' یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ" روئے سخن پانچوں کے ٹولے کی طرف تھا جو کاغذ پھاڑنے' اس کے جہاز بنانے اور اڑانے میں مصروف تھے۔

"باجی دیکھیں میرا جہاز" مانی نے ایک جہاز لہرایا۔

"یہ صفحے کہاں سے پھاڑے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور جیسے ہی کاپی پر نظر پڑی اس کی چیخ نکل گئی۔

"مومنہ کی کاپی" پھر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ "یہ کیا کیا ہے تم نے' یہ میری کاپی نہیں تھی' میری دوست کی تھی' نکل جاؤ سب میرے کمرے سے بد تمیزو!" اور وہ پانچوں جلدی سے کھسک گئے۔ "اف اب کیا کروں؟" اس نے آنسوؤں کو پونچھتے

ہوئے سوچا۔

رات کو ڈرتے ڈرتے اس نے مومنہ کو فون کیا "مومنہ مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا تھی"۔

"میں سن رہی ہوں"۔

"دراصل وہ تمہاری کاپی کے متعلق ہے"۔

"کیا ابھی تک نوٹس مکمل نہیں ہوئے؟ اچھا ایسا کرنا کل اسکول لے آنا ہم دونوں مل کر لکھ لیں گے" مومنہ اصل بات سے بے خبر بولتی گئی۔

"نہیں..... یہ بات نہیں" اسے بولنے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔

"پھر کیا بات ہے؟" سحر کے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

"وہ تمہاری..... میرے بھائی....." بات پوری کرنے سے پہلے ہی وہ رو پڑی۔

"سحر کیا ہو گیا ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ سوال سمجھ نہیں آرہے تو میں سمجھا دوں گی"۔

مومنہ واقعی پریشان ہو گئی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے کیا تسلی دے "سحر کچھ تو بولو نا!"

"میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی" بڑی مشکل سے یہ جملہ ادا کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

"جب اسے اپنی کاپی کا یہ حشر نظر آئے گا تو اس کا کیا رد عمل ہو گا؟" سحر نے سوچا اور پھر تخیل کی نگاہ سے مومنہ کو بہت غصے میں کہتے سنا:

"میں نے تمہیں کاپی اس لیے تو نہیں دی تھی کہ چھوٹے بہن بھائیوں کے حوالے کر دو کہ لو جہاز بنا کر اڑاؤ۔ مجھے میری کاپی چاہیے' صحیح سلامت حالت میں' سمجھی تم"۔

"اف!" سحر نے گھبرا کر سر جھٹکا۔ آنسو تو تھم چکے تھے مگر انجانا سا خوف مسلسل موجود تھا "اللہ میاں جی! آپ تو جانتے ہیں نا کہ اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ پلیز معاف کر دیں"۔ اس نے صدق دل سے دعا مانگی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور مومنہ آندھی' طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی "کیا ہوا ہے؟ اتنا کیوں رو رہی تھی؟ فون کیوں بند کر دیا تھا؟" اس نے ایک دم سے کئی سوال داغ دیئے اور سحر سے دیکھ کر گھبرا ہی تو گئی۔

پھر اس نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور آہستہ آہستہ رک رک کر جھجکتے ہوئے ساری بات بتا دی اور پھر بولی۔

"مومنہ یقین کرو' میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں' میرا کوئی قصور نہیں"

اس کا خیال تھا کہ مومنہ بہت ناراض ہو گی' شاید غصے میں اٹھ کر ہی چلی جائے لیکن جب اس نے اسے مسکراتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

"بس اتنی سی بات! تھوڑے سے صفحے ہی پھٹے ہیں نا جلد ہی ذرا ڈھیلی ہوئی ہے نا" اور سحر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا "تم نے میری بات کا یقین تو کر لیا ہے نا؟"

"سحر! میں نے اقوال زریں کی کتاب میں یہ پڑھا تھا کہ "ہر مسلمان کا یہ حق ہے کہ اس کا عذر قبول کیا جائے" اور تم تو صرف مسلمان ہی نہیں میری اتنی اچھی دوست بھی تو ہو" یہ کہتے ہوئے اس نے سحر کا ہاتھ تھام لیا۔

سحر کو کچھ دن پہلے کا کچھ اسی طرح کا واقعہ یاد آگیا اور اس نے سوچا "کیا میں نے اپنی مسلمان دوست کا یہ حق پہچانا تھا؟"

دوستی کا تحفہ

Sharjeel Ahmed

حسن ذکی کاظمی

جب سارے امیدوار اپنے اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئے تو ممتحن نے اعلان کیا۔

"میں ٹھہر ٹھہر کر دس چھوٹے چھوٹے جملے بولوں گا جنہیں ہر امیدوار تصویری پینل کی مدد سے کمپیوٹر اسکرین پر لکھے گا۔ جو امیدوار کم از کم سات جملے صحیح لکھ لے گا اسے پاس کر دیا جائے گا۔ پھر ہر امیدوار خود اپنی مرضی سے پانچ جملے لکھے گا۔ ان میں سے تین جملوں کا صحیح ہونا ضروری ہے۔ میری بات سمجھ میں آگئی؟"

سب امیدواروں نے "ہاں" کہنے کے لیے گردن ہلا دی۔ ممتحن نے پھر اپنی بات شروع کی۔

"بہت خوب' اچھا تو اب سے پورے تیس سکنڈ کے بعد میں جملے بولنا شروع کروں گا۔ آپ سب تیار ہو جائیں"۔

پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد انہوں نے امتحان شروع کیا۔

"دو پیالی کافی لاؤ۔ موسم خراب ہے۔ ہوشیار' خطرہ ہے۔ پھل مزے دار ہیں۔ بجلی جلا دو....."

جب دس جملے پورے ہو گئے تو امیدواروں سے کہا گیا کہ نیچے وہ اپنا نام اور اپنے کمپیوٹر کا نمبر لکھ دیں اور پھر پرنٹ آؤٹ نکالیں۔ اس کے بعد امتحان کا دوسرا حصہ شروع ہوا جس میں پانچ منٹ کے دوران میں ہر امیدوار کو پانچ جملے لکھنا یا بنانا تھے۔ امتحان ختم ہوا تو امیدواروں کو بتایا گیا کہ ایک دن بعد ان کے اسکول کو نتیجے کی اطلاع دے دی جائے گی اور جو امیدوار کام یاب ہوں گے انہیں پھر انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا۔ یہ سن کر سارے امیدوار اچھلتے کودتے امتحان کے کمرے سے نکل گئے اور باہر کھڑی ہوئی بس میں جا بیٹھے۔ ڈرائیور نے ان کی گنتی کی اور دروازے کا تالا بند کر کے بس چلا دی۔ ہر امیدوار کے دماغ میں یہی سوال تھا کہ کیا وہ کام یاب ہو جائے گا اور اسے اس خوب صورت جگہ کام کرنے کا موقع مل سکے گا۔

دوسرے دن اسکول میں نتیجہ پہنچا تو امیدواروں کی بھی بہت حوصلہ افزائی ہوئی اور استاد بھی بہت خوش ہوئے۔ 40 میں سے 35 امیدوار کام یاب ہو گئے۔ باقی 5 کا بھی نتیجہ زیادہ برا نہیں تھا۔ ان سے وعدہ کیا گیا کہ دو مہینے بعد انہیں پھر امتحان کے لیے بلایا جائے گا اور امید ہے کہ وہ بھی کام یاب ہو جائیں گے۔ 35 میں سے 35 امیدوار انٹرویو میں کام یاب ہو گئے اور 5

کو دو ماہ بعد بلایا گیا۔ تیس امیدواروں کو اسی وقت اطلاع دے دی گئی کہ وہ یکم جولائی سے کام شروع کر دیں۔ کام کی شرائط اور تنخواہ وغیرہ کے بارے میں ان کے اسکول کو بتا دیا جائے گا۔

چند روز بعد اسکول میں ملازمت کی جو شرائط بھیجی گئیں وہ 2003ء کے ترقی یافتہ دور میں کچھ عجیب سی تھیں۔ مثلاً یہ کہ باغ اور فارم میں کھلی رہائشی سہولت مہیا کی جائے گی۔ تنخواہ پچیس ڈالر ماہانہ 'کیلا الاؤنس تیس ڈالر ماہانہ' مونگ پھلی الاؤنس چالیس ڈالر ماہانہ' کھانا مفت' کپڑے مفت' دفتر کی طرف سے کمپیوٹر بھی فراہم کیا جائے گا اور بائی سکل بھی"۔

یکم جولائی کو سارے کامیاب امیدوار زرعی تحقیق کے دفتر پہنچ گئے اور انہیں ان کی ڈیوٹی سمجھا دی گئی۔ پروفیسر ولسن کے حصے میں جو امیدوار آیا اس کا نام مانو تھا۔ اس نے جلد ہی دفتر کا چھوٹا موٹا کام سنبھال لیا۔ مثلاً الماری میں فائلیں ترتیب سے رکھنا۔ مہمانوں کے آنے کی اطلاع پروفیسر کو دینا۔ کینٹین سے چائے کافی وغیرہ منگوانا۔ پروفیسر ولسن مانو کے کام سے کافی خوش تھے اور ان کی سیکریٹری پر بھی کام کا بوجھ تھوڑا کم ہو گیا تھا۔ ایک دن کسی خاتون نے پروفیسر ولسن کو ٹیلی فون کیا۔

"آپ نے میرا وہ مضمون پڑھ لیا جو آلو کی کاشت کے نئے طریقوں کے بارے میں ہے؟"

پروفیسر نے جواب دیا "ہاں وہ میں نے پڑھ لیا ہے اور اس میں کچھ تبدیلی بھی کی ہے۔ تم جب چاہو میرے دفتر سے لے لو"۔

"کل صبح؟" خاتون نے پوچھا۔

پروفیسر نے جواب میں کہا۔ "کل صبح میں دفتر میں نہیں ہوں گا اور سیکریٹری بھی چھٹی پر ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ سیکرٹری کے برابر میں میرے ہیلپر کا کمرا ہے۔ یہ ہیلپر ہم نے نئے بھرتی کئے ہیں۔ میں تمہارا مضمون فائل کور میں رکھ کر اور تمہارا نام لکھ کر اپنے ہیلپر کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔ تم اس سے لے لینا"۔

دوسرے دن یہ خاتون مضمون لینے کے لیے پروفیسر کے دفتر آئیں تو دیکھا کہ سکریٹری کے برابر والے کمرے پر "ہیلپر" کی تختی لگی ہے۔ خاتون نے دروازے پر دستک دی تو اس پر لگے ہوئے ایک چھوٹے سے پینل میں روشنی ہوئی اور اس پر لکھا ہوا آیا "اندر آجائیں"۔

خاتون نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوتے ہوئے ان کی نگاہ سامنے بیٹھے ہوئے ہیلپر پر پڑی۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے چیخ مار کر باہر نکل آئیں اور گھبراہٹ اور خوف کی حالت میں سیدھی اپنی کار کی طرف بھاگیں۔

دوسرے دن خاتون نے پروفیسر ولسن کو ٹیلی فون کیا اور بڑے شکایت بھرے لہجے میں بولیں۔ "پروفیسر! آپ نے میرے ساتھ عجیب مذاق کیا۔ میں کل اپنا مضمون لینے آئی تو....."۔

پروفیسر ولسن نے خاتون کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی کہا "بھئی اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ میں نے تو آپ کو بتا دیا تھا کہ میں دفتر میں نہیں ہوں گا اور سکریٹری بھی کل چھٹی پر تھی۔ تمہارا مضمون ہیلپر کے پاس چھوڑ گیا تھا لیکن تم آئی ہی نہیں"۔

خاتون نے کہا "جناب! میں آئی تھی لیکن ہیلپر کے کمرے میں تو....."

پروفیسر ولسن نے قہقہہ لگایا اور بولے "اچھا اچھا اب سمجھا۔ بھئی میں معافی چاہتا ہوں۔ تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ اچھا ایسا کرو کہ ابھی آجاؤ۔ میں اس وقت ذرا فارغ بھی ہوں۔ ہیلپر سے تمہارا تعارف بھی کرا دوں گا اور کافی بھی پی لینا۔ ساتھ ساتھ آئندہ والی تحقیق پر بھی بات ہو جائے گی"۔

خاتون دفتر پہنچیں تو سکریٹری کے کمرے میں گئیں۔ اس نے پروفیسر کو اطلاع دی اور انہوں نے خاتون کو فوراً بلا لیا۔ ابھی وہ بیٹھی ہی تھیں کہ پروفیسر نے انٹر کوم کا بٹن دبا کر کہا۔ "مانو پلیز دو پیالی کافی"۔

ہیلپر نے ادھر اپنے کمپیوٹر کے پینل کے خانوں پر انگلیاں رکھیں اور ادھر کینٹین کے اسکرین پر لکھا ہوا آیا "پروفیسر ولسن کے لیے دو پیالی کافی"۔

پروفیسر اور خاتون کافی پیتے رہے اور زرعی تحقیق کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کافی ختم ہوئی تو پروفیسر نے خاتون سے کہا "چلو ہیلپر سے اپنا مضمون بھی لے لو اور اس سے تمہیں ملوا بھی دوں۔ تاکہ آیندہ کوئی ضرورت ہو تو اسے بتا دینا"۔

پروفیسر خاتون کو ساتھ لیے ہیلپر کے کمرے میں پہنچے۔ دروازے پر دستک دی تو پینل پر لکھا ہوا آیا "اندر آجائیں"

دونوں اندر داخل ہوئے تو خاتون ڈری سہمی پروفیسر کی آڑ میں تھیں۔ پروفیسر نے ان سے کہا۔ "ڈرو نہیں یہ مانو ہیں۔ میرے ہیلپر۔ میری واقعی بہت مدد کرتے ہیں۔ اور یہ ہیں نیشا بہت بڑی زرعی سائنس دان"۔

مانو نے ہاتھ ہلا کر ہیلو کیا اور سر تھوڑا سا جھکا دیا پھر اس نے مضمون کی فائل خاتون کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے مانو کا شکریہ ادا کیا اور پروفیسر کے ساتھ کمرے سے باہر آگئیں۔

پروفیسر نے نیشا کے چہرے پر حیرانی اور پریشانی دیکھی تو بولے۔ "میرے ساتھ کمرے میں آؤ۔ دو منٹ میں میں تمہاری حیرانی دور کر دوں گا"۔

کمرے میں پہنچ کر پروفیسر اور نیشا صوفے پر بیٹھ گئے اور پروفیسر نے بات شروع کی۔ "بھئی نیشا! آپ بن مانس کو میرے دفتر میں دیکھ کر اس قدر حیران نہ ہوں۔ تم زرعی سائنس دان۔ سہی لیکن ہو تو سائنس دان تمہیں معلوم ہے کہ ذہانت کے معاملہ بن مانس دوسرے جانوروں کی نسبت انسان سے بہت قریب ہے۔ اب کمپیوٹر ٹیکنالوجی اسے انسان سے اور بھی قریب لے آئی ہے۔ چند سال پہلے یعنی بیسویں صدی کے آخر میں اٹلانٹا کے سائنس دانوں نے بن مانس کے لیے ایک خصوصی کمپیوٹر ایجاد کیا۔ اس میں کی بورڈ کے بجائے ایک بڑا سا چپٹا پینل لگا ہوا ہے جس پر بہت سے خانے بنے ہوئے ہیں۔ جب بن مانس کسی خانہ پر انگلی رکھتا ہے تو اسکرین پر ایک خاص چیز کی تصویر آجاتی ہے اور ریکارڈ کی ہوئی آواز بھی بتاتی ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ مثال کے طور پر بن مانس نے ایک خانے میں بنے ہوئے نشان پر انگلی رکھی۔ سامنے اسکرین پر سیب کی شکل بن گئی اور ریکارڈ کی ہوئی آواز نے انگریزی میں کہا "سیب" بار بار ایسا کرنے کے بعد بن مانس کو یہ یاد ہو جائے گا کہ اس نشان کا تعلق سیب سے ہے۔

اسی طرح بن مانس مختلف لفظ، اشارے اور چیزوں کے نام بھی پہچاننے لگے گا اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کن نشانوں کا تعلق روشنی، اندھیرے، خطرے، موسم اور بارش وغیرہ سے ہے"۔

نیشا نے حیرانی سے کہا "یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ یہ کس طرح ہوا؟"

پروفیسر مسکراتے ہوئے بولے۔ "نیشا! جدید ٹیکنالوجی نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ جارجیا اسٹیٹ یونی ورسٹی میں ایک لمبی چوڑی تجربہ گاہ ہے جہاں اس خصوصی کمپیوٹر پر کئی سال سے بن مانسوں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ وہاں ایک بن مانس تو ایسا ہے جو تین ہزار الفاظ سیکھ چکا ہے"۔

یہ کہ کر پروفیسر زور سے ہنسے اور پھر بولے۔ ”بھئی عجیب اتفاق ہے۔ تم برا نہ ماننا۔ اس ذہین بن مانس کا نام تم سے کچھ ملتا جلتا ہے‘ پنبانیشا۔ اور یہ بات آج کی نہیں ہے تین چار سال پہلے کی ہے جب اس نے تین ہزار الفاظ جان لیے تھے۔ اب تو کہیں آگے پہنچ چکا ہو گا۔ اس ٹیکنالوجی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اور بن مانس میں زبان کا ایک رابطہ قائم ہو جائے۔ بن مانس کمپیوٹر کے اس پینل کو جہاں چاہیں لے جا سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ اسکرین کو بھی ساتھ رکھیں۔ اسکرین کسی دوسرے کمرے یا عمارت یا کھلی جگہ میں بھی رکھا جا سکتا ہے لیکن پینل اور اسکرین میں رابطہ رہتا ہے۔

جیسا میں نے پہلے بتایا جارجیا اسٹیٹ یونی ورسٹی میں بن مانسوں کی تربیت کا سلسلہ بیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوا تھا۔ اب تین چار سال میں کمپیوٹر بھی بہتر بنا دیا گیا ہے اور تربیت بھی بہتر طریقہ سے ہو رہی ہے۔ اب یہ تربیت بالکل ایسے ہوتی ہے جیسے آپس میں باتیں ہو رہی ہوں اور باتیں بھی کسی جانور سے نہیں جیسے انسان سے یا انسان کے ایسے بچے سے ہو رہی ہوں جو ذرا بہرا ہو یا جسے بولنے میں کچھ دقت ہو رہی ہو۔ چند سال کی محنت کے بعد اب یہ تربیت یافتہ بن مانس اچھے خاصے جملے بنانے لگے ہیں اور کمپیوٹر کے ذریعے چھوٹے موٹے کام بھی کر لیتے ہیں‘ حساب لگا لیتے ہیں‘ دن تاریخ معلوم کر لیتے ہیں..... وغیرہ وغیرہ“۔

نیشا بڑے غور سے پروفیسر کی باتیں سنتی رہی اور بیچ میں بولیں ”لیکن پروفیسر یہ بن مانس جملے بڑی سست رفتار سے لکھتے ہوں گے؟“

پروفیسر ولسن نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بات یہ ہے کہ شروع شروع میں تو رفتار بہت سست ہوتی ہے لیکن مشق کے ساتھ ساتھ یہ رفتار تیز ہو جاتی ہے اور پھر تو بن مانس کی انگلیاں ایسی تیزی سے خانوں کو چھوتی ہیں جیسے ایک ماہر ٹائپسٹ اپنا کام کر رہا ہو۔ لیکن یہ اب ممکن ہوا ہے یعنی 2003ء میں“۔

نیشا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اچھا پروفیسر! یہ بتائیے کہ کیا ایک تربیت یافتہ بن مانس مجھے ہیلپر کے طور پر مل سکتا ہے؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جارجیا کے تربیتی اسکول والے تو خود یہ چاہ رہے ہیں کہ ان کے تربیت یافتہ شاگرد مختلف جگہ کام کریں تاکہ انہیں اندازہ ہو جائے کہ وہ کس حد تک کام یاب ہوئے ہیں۔ میں ابھی فون پر بات کرتا ہوں“۔

تین دن بھی نہ گزرے تھے کہ نیوٹا نامی بن مانس اپنے کمپیوٹر اور اٹیچی کیس کے ساتھ نیشا کے فارم پر پہنچ گیا۔ نیوٹا کے آنے کی خوشی سب سے زیادہ نیشا کے آٹھ سالہ بیٹے ٹونی کو تھی۔ رفتہ رفتہ نیوٹا گھر کی اور فارم کی چوکی داری کے علاوہ فارم کے چھوٹے موٹے کاموں میں نیشا کا ہاتھ بھی بٹانے لگا۔ لیکن اس کا اصل کام ٹونی کا دل بہلانا تھا۔ ٹونی کو اپنے اسکول اور گھر کی پڑھائی

کے بعد جو وقت ملتا اسے وہ نیوٹا کے ساتھ گزارتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ٹونی گھر پر پڑھتا رہتا اور نیوٹا اپنے کمپیوٹر پر مشق کرتا رہتا۔

ٹونی کے دوست ایڈی کو نیوٹا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ اکثر ٹونی سے کہتا رہتا "یہ کیا خوف ناک چیز پال لی ہے تم نے؟ عجیب شوق ہے۔ بھگاؤ اس جانور کو یہاں سے ورنہ میں یہاں آنا چھوڑ دوں گا"۔ ٹونی ہنس کے اس کی بات ٹال دیتا۔ لیکن ایسا لگتا تھا جیسے نیوٹا اس کی ایک ایک بات سمجھ رہا ہو۔ پھر یہ ہوا کہ جب ایڈی آتا تو نیوٹا فوراً ادھر ادھر ہو جاتا۔ ایک دن ٹونی نے اس سے پوچھا۔ "نیوٹا! جب میرا دوست آتا ہے تو تم غائب کیوں ہو جاتے ہو؟"

نیوٹا نے ذرا ناراضگی سے کمپیوٹر پینل پر انگلیاں چلانا شروع کیں اور اسکرین پر لکھا۔ "میں جانور وہ انسان"

"کیا فرق پڑتا ہے؟" ٹونی نے کہا۔

نیوٹا کچھ نہ بولا لیکن کھی کھی کر کے ایسے ہنسا جیسے طنزیہ ہنسی ہنس رہا ہو اور پھر وہ فوراً اپنی نیکر سنبھالتا ہوا بھاگ گیا۔ چند دن بعد نیوٹا اور ٹونی سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کمپیوٹر پینل نیوٹا کے سامنے تھا اور اسکرین نیشا کے پاس تھا جو ٹریکٹر پر بیٹھی تھوڑی دور فارم میں کام کر رہی تھی۔

نیوٹا کچھ کمپیوٹر کے بارے میں اشاروں سے بتا رہا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور اس نے بائی سکل پر کچھ کرتب دکھانا شروع کیے۔ ٹونی ہنسی سے لوٹا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایڈی آگیا اور ٹونی کو اس طرح ہنستے ہوئے دیکھ کر بولا۔ "یار کیا ہو گیا ہے تمہیں' اس جنگلی کی باتوں پر ایسے خوش ہو رہے ہو جیسے یہ انسان کا بچہ ہو۔ مجھے تو اسے دیکھ کر گھن آتی ہے۔ بھگاؤ اسے میں اس کا دشمن ہوں"۔

نیوٹا نے بات سمجھ لی اور وہ جانے ہی والا تھا کہ ٹونی نے اسے روک دیا اور وہیں کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ پھر وہ ایڈی کو ساتھ لے کر اندر گیا اور چند منٹ بعد دونوں تیراکی کا لباس پہن کر باہر آئے اور سوئمنگ پول میں کود پڑے۔ نہاتے نہاتے ایڈی نے زیادہ گہرائی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ٹونی اسے منع کرتا رہا۔ "ایڈی! تمہیں ابھی اچھی طرح تیرنا نہیں آتا۔ ادھر نہ جاؤ"۔ لیکن ایڈی نے اس کی بات نہ مانی اور وہ کچھ اور آگے چلا گیا۔ ٹونی نے پھر اسے منع کیا اور چیخنے لگا۔ نیشا کچھ دور بھی تھی اور ٹریکٹر کا شور بھی تھا۔ اس نے کچھ نہیں سنا۔ نیوٹا نے جو شور سنا تو فوراً کمپیوٹر پینل پر انگلیاں پھیرنا شروع کیں۔ ٹریکٹر پر رکھے ہوئے اسکرین پر پہلے گھنٹی بجی اور جب نیشا نے ادھر دیکھا تو لکھا تھا۔

"خطرہ خطرہ مدد"

نیشا نے فوراً ٹریکٹر بند کیا اور کود کر پول کی طرف دوڑی۔ بچاؤ بچاؤ کی آواز اس کے کان میں آرہی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی وہ پول میں کود پڑی اور ایڈی کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ ایک دو غوطے کھا چکا تھا اور پیٹ میں پانی بھر گیا تھا۔ نیشا نے سخت پریشانی کے عالم میں ایمرجنسی نمبر پر فون کر کے طبی امداد بلائی اور یہ امداد پہنچنے تک وہ نیوٹا کی مدد سے ایڈی کو فرسٹ ایڈ دیتی رہی۔ ایڈی کو ہوش آیا تو سب لوگ اس کے قریب تھے۔ اس نے پہلی بات یہی پوچھی۔ "میری جان کس نے بچائی؟"

ٹونی نے کہا۔ "جنگلی جانور نے"۔

ایڈی نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے پوری بات بتائی۔ ایڈی بالکل خاموش ہو گیا اور پھر دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

چند روز بعد ایڈی ٹونی کے گھر آیا۔ ٹونی اور نیوٹا بیٹھے نیوٹا کے کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہے تھے۔ ایڈی کے آتے ہی نیوٹا وہاں سے جانے لگا۔ ایڈی نے اس کا رستہ روکا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ جب نیوٹا بیٹھ گیا تو ایڈی نے ایک چھوٹی سی ٹوکری اس کی طرف بڑھائی۔ نیوٹا نے سوالیہ نظروں سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

ایڈی نے کچھ شرمندگی کے انداز میں کہا۔ "دوستی کا تحفہ"۔

نیوٹا ٹوکری میں رکھے ہوئے کیلے' مونگ پھلی اور چاکلیٹ دیکھ کر مسکرایا اور فوراً کمپیوٹر پینل پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ اسکرین پر لکھا تھا۔

"انسان اور جنگلی جانور کی دوستی؟"

ایڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور بولا "ہاں پکی دوستی"۔

Sharjeel Ahmed

آیئے مسکرائیں

کلرک: (دیہاتی سے): یہ پارسل بھاری ہے اس پر اور ٹکٹ لگے گا۔
دیہاتی: لیکن بابو صاحب، ٹکٹ لگنے سے تو اور زیادہ بھاری ہو جائے گا
(ثروت نور شاہ درہ)

انصر (دکان دار سے): مجھے ایک خالی شیشی چاہیے
دکان دار: خالی شیشی تو دو روپے میں ملے گی۔ اس میں کچھ ڈلوالو تو شیشی کی قیمت نہیں لی جائے گی۔
انصر: اچھا تو اس میں پانی ڈال دیں (مبشر الٰہی شاہ درہ)

ایک جاگیر دار صاحب شہر میں اپنے نئے پڑوسی کو مرعوب کرنے کے لیے بتا رہے تھے۔
"اگر میں صبح اپنی کار میں بیٹھ کر اپنی زمینیں دیکھنے نکلوں تو شام تک آدھی زمین بھی دیکھ نہیں پاتا"
پڑوسی نے اظہار افسوس کیا "بہت پہلے ہمارے پاس بھی ایسی ہی ایک کھٹارا کار ہوا کرتی تھی"
(فیض الحسن کوٹ ادو)

بوبی (دانتوں کے ڈاکٹر سے): ڈاکٹر صاحب، آپ کئی دنوں سے میرے دانت نکال رہے ہیں اور ہمیشہ غلط دانت نکال دیتے ہیں۔
ڈاکٹر: آج یقیناً صحیح دانت نکالنے میں کام یاب ہو جاؤں گا کیوں کہ اب آپ کے منہ میں صرف ایک دانت ہی بچا ہے
(صدف اقبال نیو ملتان)

کسی جگہ ایک اندھا فقیر رہتا تھا۔ اس میں یہ صلاحیت تھی کہ کسی جانور کے گوشت کو ہاتھ لگاتے ہی اسے پتا چل جاتا کہ کون سے جانور کا گوشت ہے۔
ایک دفعہ وہ قصاب کی دکان پر گیا اور لٹکے ہوئے گوشت کو ہاتھ لگا کر کہا "یہ بھیڑ کا گوشت ہے" پھر دوسرے گوشت کو ہاتھ لگا کر کہا "یہ بکرے کا گوشت ہے"۔
دکان دار کو شرارت سوجھی۔ اس نے اپنی قمیص اٹھائی اور فقیر کا ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ کر پوچھا "یہ کون سا گوشت ہے؟"
فقیر: اچھا تو آپ گدھے کا گوشت بھی بیچتے ہیں
(ارسلان الٰہی شاہ درہ)

استاد: تم دیر سے کیوں آئے ہو؟
شاگرد: سر! بس نہیں مل رہی تھی۔
استاد: اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ضروری چیزیں رات ہی کو ڈھونڈ لیا کرو (شمیم خالد، عبدالحکیم)

ایک عورت اپنے مرحوم شوہر کی قبر پر گئی۔ کتبے پر لکھا تھا
مسز پروفیسر ایم ڈی آسا
کسی نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا "میرا شوہر سارا کاروبار میرے نام سے کرتا تھا۔ قبر بھی میرے ہی نام پر بنوالی (مرزا مبشر حسین، شاہ کوٹ)

(ایک آدمی دکان دار سے): "جناب ایک اچھا سا پنجرہ دکھایئے"۔
دکان دار: بہتر جناب! ابھی دکھاتا ہوں۔
گاہک: صاحب جلدی کیجئے نا میں نے گاڑی پکڑنی ہے۔
دکان دار: معاف کیجئے جناب! اتنا بڑا پنجرہ تو ہمارے پاس نہیں ہے (قیصر عزیز منگلا چھاؤنی)

چاچو چاند بنے پہلوان

محمد معروف چشتی

جولائی کی ایک سخت دوپہر کو چاچو چاند اپنے دونوں بھتیجوں کے ہم راہ چک فردوس پور کو جانے والی کچی سڑک پر چلے جارہے تھے۔ گرمی کے مارے ان کا برا حال تھا۔ آگے آگے چاچو چاند سر جھکائے چل رہے تھے اور پیچھے پیچھے عاصم اور قاسم ایک بھاری سا بیگ اٹھائے جارہے تھے۔

"اف! لگتا ہے میں تو گرمی سے مر ہی جاؤں گا" چاچو نے کہا۔

"ارے نہ چاچو جان ایسا ظلم نہ کیجئے گا۔ ایک بیگ تو ہم سے اٹھایا نہیں جارہا آپ کو کیسے اٹھائیں گے؟" قاسم نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں سچ مچ تھوڑی مر رہا ہوں۔ میں تو محاورتاً کہہ رہا تھا" چاچو چاند نے بھنا کر کہا۔

"چاچو میرا بھی دم نکلا جارہا ہے۔ تھوڑا سا ستا نہ لیں" عاصم نے کہا۔

"ہاں یہ بات معقول ہے۔ آجاؤ وہ سامنے نہر ہے وہاں درخت بھی گھنے ہیں ہم وہاں بیٹھیں گے اور پانی بھی پی لیں گے" چاچو نے کہا اور تینوں نہر کنارے درختوں کے سائے کی جانب چل دیئے۔

دراصل گرمیوں کی چھٹیوں میں ان کا پکا پروگرام تھا کہ وادی کاغان کی سیر کی جائے مگر ابو کی مصروفیات کی وجہ سے وہ وادی کاغان تو نہ جاسکے البتہ ابو نے انہیں گاؤں بھیج دیا۔ گاؤں میں عاصم اور قاسم کے ماموں فراز احمد رہتے تھے۔

درختوں کے سائے تلے انہوں نے بیگ رکھا' نہر کے پانی سے پیاس بجھائی اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو تازہ دم ہوگئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔

"چاچو کیا خیال ہے نہر میں نہانہ لیا جائے؟" قاسم نے خیال ظاہر کیا۔

"خیال تو اچھا ہے اور ہمارے بیگ میں نیکریں بھی موجود ہیں" عاصم نے تائید کی۔

"چلو نکالو پھر نیکریں' تم دونوں تیار ہو تو میں بھی تیار ہوں" چاچو نے خوش ہو کر کہا۔ کچھ دیر کے بعد تینوں نہر کے پانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"چاچو وہ دیکھیں وہ تو مجھے امرود کا باغ معلوم ہوتا ہے" عاصم نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں دیکھیں چاچو وہ امرود ہی ہیں۔ ارے کتنا مزہ آئے اگر ہم پودوں سے تازہ امرود توڑ کر کھائیں" قاسم نے کہا۔

"نہیں بھئی ہم یوں بلا اجازت کیسے امرود توڑ سکتے

ہیں؟" یہ تو چوری ہو گی اور گناہ بھی" چاچو چاند نے امرود توڑنے سے صاف انکار کر دیا۔

"ارے چاچو جان ہم چوری تو نہیں کریں گے۔ ہم امرود توڑنے کے بعد ان کی قیمت ادا کر دیں گے" قاسم نے بات بنائی۔

"تو پھر آؤ پہلے مالک کو ڈھونڈ لیں" چاچو چاند نے کہا۔

"نہیں چاچو جان میرے خیال میں یہاں اس کا مالک موجود نہیں وہ یقیناً فردوس پور میں ہو گا۔ ہم امرود توڑ کر لے چلتے ہیں اور وہاں جا کر پیسے دے دیں گے"۔ قاسم بہانے بنا رہا تھا۔ دراصل وہ مفت میں امرود کھانا چاہتا تھا۔

"ویسے بھی چاچو اب امرود کھانے کو دل چاہ رہا ہے دیکھیں ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے امرود دھو کر اور یہاں بیٹھ کر کھائیں گے تو مزہ آجائے گا لہٰذا فوراً امرود ہونے چاہئیں" عاصم نے قاسم کا ساتھ دیا۔

"ٹھیک ہے بھئی تم مجبور کرتے ہو تو آؤ۔ آخر بڑا ہوں اتنا خیال تو کرنا پڑے گا تمہارا" چاچو نے چار و ناچار کہا۔

"چاچو ہم کیسے آپ کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ ادھر بیگ اور کپڑوں کا خیال بھی تو رکھنا ہے" قاسم نے بہانہ بنا لیا تاکہ گرمی میں اسے نہ جانا پڑے۔

"تو پھر قاسم یہیں رہے' عاصم میرے ساتھ آجائے"۔

"چاچو مجھے اکیلے میں ڈر لگے گا۔ عاصم کو بھی یہیں چھوڑ جائیں اور آپ تو اتنے بہادر ہیں امرود لانا آپ کے لیے کون سا مشکل کام ہے۔ دوڑ کر لے آئیے ناں اچھے چاچو" قاسم نے مکھن لگاتے ہوئے کہا اور چاچو واقعی خود کو بہادر سمجھ کر باغ کی طرف چل پڑے۔ قاسم اور عاصم ہولے ہولے ہنسنے لگے۔

چاچو چاند نے باغ کی چھوٹی سی کچی دیوار پھلانگی اور اندر داخل ہو گئے۔ انہیں کوئی انسان یا جانور نظر نہ آیا۔ وہ کچھ دور آگے چلتے گئے پھر انہیں ایک پودے پر قدرے اچھے امرود نظر آگئے اور وہ امرود توڑنے لگے۔ کافی سارے امرود توڑ کر انہوں نے اپنی لمبی نیکر کی جیبوں میں ٹھونس لیے۔ ابھی وہ واپسی کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ یکایک انہیں اپنے پیچھے ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ چاچو چاند کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے ہلکی سی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو ان کا خیال درست ثابت ہوا۔ پیچھے ایک کتا کھڑا ان پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ جیسے ہی چاچو کی نظر کتے پر پڑی ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ پھر اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوئے۔ امرود ایک ایک کر کے ان کی جیبوں سے گرنے لگے۔ مگر انہیں کس بات کا ہوش تھا۔ کتا شاید ڈرانے دھمکانے کے لیے رکھا گیا تھا جبھی تو وہ بھاگ تھوڑا رہا تھا اور بھونک زیادہ رہا تھا مگر چاچو کی تو مت پوچھیے۔ ڈر کے مارے ان کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اسی اندھا دھند دوڑ میں جلد ہی وہ باغ کی دوسری دیوار سے چھلانگ لگا کر باہر گرے اور مٹی میں لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ان کی عینک بھی اسی چھلانگ میں کہیں اللہ کو پیاری ہو گئی مگر انہوں نے آؤ دیکھا نہ

تاؤ اٹھ کر پھر دوڑ لگادی۔

امرودوں کے باغ سے کچھ دور دوسری طرف ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ لوگ کافی تعداد میں شریک تھے۔ مگر سب سے زیادہ بھیڑ کبڈی کے میدان میں تھی کیوں کہ آج دو بہت اچھے پہلوانوں کے درمیان کشتی کا مقابلہ ہونے والا تھا۔ ایک پہلوان تو میدان میں موجود تھا جب کہ دوسرا پہلوان جسے کسی دوسرے گاؤں سے آنا تھا ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے سب کی نظریں باغ کے ساتھ والے رستے پر جمی تھیں۔ سب بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کیوں کہ یہ چیلنج مقابلہ تھا۔ دوسرے گاؤں سے آنے والے پہلوان نے چیلنج قبول کیا تھا۔ اگرچہ وہ کوئی مشہور پہلوان نہ تھا مگر اس کے چیلنج قبول کرنے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی کوئی اچھا پہلوان ہی ہوگا۔ اس لیے سب اس کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ اتنے میں دور سے انہیں ایک شخص بھاگتا ہوا نظر آیا۔ وہ انہیں کی طرف آرہا تھا۔ سارے لوگوں میں اک جوش سا بھر گیا۔ وہ سمجھ گئے کہ چیلنج قبول کرنے والا پہلوان پہنچ چکا ہے۔

ڈھولچیوں نے ڈھول پیٹنے شروع کر دیئے اور لوگ ہاؤ ہو کے نعرے بلند کرنے لگے۔ آنے والا نیا پہلوان ابھی دور ہی تھا کہ لوگوں نے بھاگ کر اس کا استقبال کیا اور اس کو کاندھوں پر اٹھالیا۔ کیوں کہ لوگ آج چیلنج کرنے والے پہلوان کا غرور ٹوٹتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ آنے والا پہلوان سوکھا سا تھا۔ اس نے لوگوں سے بات کرنا چاہی مگر من چلے نوجوان اس کو کاندھوں پر اٹھا کر میدان کا چکر لگانے لگے اور کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ آخر ریفری نے مقابلہ شروع کرنے کا اعلان کیا اور نئے پہلوان کو اکھاڑے میں لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ لوگوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا اور ڈھولچی ڈھول پیٹ پیٹ کر لال سرخ ہوئے جا رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

مقابلہ شروع ہوا۔ نیا پہلوان دوسرے پہلوان کے پاس جا کر شاید کوئی بات کرنا چاہتا تھا مگر دوسرا پہلوان سمجھ رہا تھا کہ یہ حملہ کرنے والا ہے اس لیے وہ جھکائی دے جاتا۔ آخر دوسرے پہلوان نے ہمت سے کام لیا اور آگے بڑھ کر نئے پہلوان کو ہاتھوں پر اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ نیا پہلوان اٹھ کر پھر اس کی طرف بڑھا۔ وہ یوں ہاتھ جوڑ کر دوسرے پہلوان کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے معافی طلب کر رہا ہو مگر دوسرا پہلوان سمجھا کہ شاید یہ اس کا کوئی داؤ ہے۔ اس نے نئے پہلوان کو پکڑ لیا اور اس کو مٹی میں خوب رگیدا۔

ادھر عاصم، قاسم، چاچو کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو اپنا ساز و سامان اٹھا کر چاچو کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے کبڈی کے میدان تک آپہنچے۔ یک دم عاصم رک گیا اور بولا "قاسم! بوجھو تو میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"مجھے کیا معلوم تم کیا دیکھ ..... ارے وہ تو چاچو چاند ہیں۔ چاچو کشتی کب سے لڑنے لگے؟" قاسم نے حیرانی سے پوچھا۔

"ارے رے رے قاسم دوڑو دیکھو چاچو پٹ رہے ہیں"

"وہ دیکھو انہیں دھوبی پٹکا لگ گیا، جلدی کرو"۔

دونوں میدان کی طرف دوڑے مگر اسی اثنا میں چاچو چاند کو اک ترکیب سوجھی۔ انہوں نے زور دار نعرہ لگایا "یا ہو" اور تماشائیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ تماشائی گھبرا کر پیچھے ہٹے تو چاچو چاند نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور یہ جا وہ جا۔ ان کا رخ گاؤں کی آبادی کی طرف تھا۔ عاصم اور قاسم نے یہ منظر دیکھا تو قہقہہ لگا کر ہنسے اور گاؤں کی طرف چل دیئے۔ انہیں معلوم تھا کہ چاچو سیدھے ماموں فراز احمد کے گھر جائیں گے۔

کچھ دیر کے بعد جب عاصم اور قاسم بھی گھر پہنچے تو چاچو چاند نہائے دھوئے بیٹھے تھے۔ قاسم کو تو موقع چاہیے ہوتا ہے، فوراً بولا "چاچو جان! کشتی کے میدان میں امرود کب سے اگنے لگے؟"

یہ سن کر سب ہنسنے لگے اور چاچو چاند کھسیانے سے ہو کر رہ گئے۔

اس واقعہ کو چار سال گزر چکے ہیں مگر پھر کبھی چاچو چاند نے چوری امرود توڑنے کی جرات نہیں کی۔

یوم دفاع

محمد مسعود، گوٹری (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

ریحان سراج، راول پنڈی (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

آصف الرحمان چنیوٹ (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

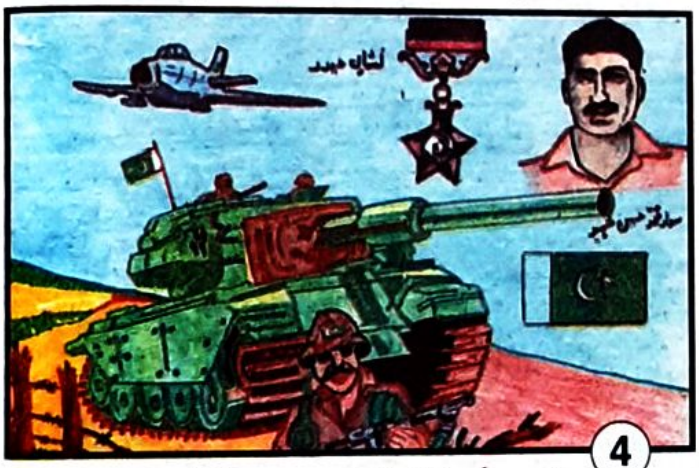

فریحہ احمد کراچی (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

عثمان ارشد جنجوعہ سیال کوٹ (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

شاہد حسین جھنگ صدر (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان نونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: واصف خان ہری پور۔ قیصر عزیز منگلا چھاؤنی۔ محمد انصر اقبال سرگودھا۔ میمونہ گیلانی لاہور۔ محمد حماد ملتان۔ محمد خالد حسین تونسہ۔ فرحان سلیم بہاول پور۔ عثمان فاروق راول پنڈی۔ محمد شائق بشیر روہڑی۔ عمر رضا ساہی وال۔ احمد حسن میاں والی۔ میمونہ فاروق راول پنڈی۔ ثنا راٹھور فیصل آباد۔ عدنان مجید لون مظفر آباد۔ محمد خالد محمود جمال پور۔ اویس حسن شاہ چشمہ بیراج۔ ثروت اقبال ساہی وال۔ محمد عبدالرحمان رؤف فیصل آباد۔ قرۃ العین یوسف لاہور۔ سید علی فرخ کاظمی سرگودھا۔ مدیحہ اصغر صادق آباد۔ رابعہ شوکت علی سیال کوٹ۔ محمد عرفان آفریدی کراچی۔ رابعہ صادق بہاول پور۔ زبیدہ کوثر راول پنڈی۔ محمد وسیم صابر چک 148 گ ب چوبلہ۔ عبدالستار فضل ایبٹ آباد۔ اویس احمد جوئیہ ساہی وال۔ احسن کلیم کراچی۔ محمد مبشر عثمان فیصل آباد۔

اکتوبر کا موضوع: برسات کے نظارے — آخری تاریخ 7 ستمبر

نومبر کا موضوع: آتش زدگی کا منظر — آخری تاریخ 7 اکتوبر

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور اپنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

Shareel Ahmed

شکاری بادشاہ

سلیم خان گی

مغلیہ خاندان کا سب سے بڑا حکم ران اکبر جسے اکبر اعظم اور مغل اعظم کہا جاتا ہے اور مورخ اس کی خوبیاں گنواتے نہیں تھکتے' اپنے بیٹے سلیم کو پیار سے شیخو کہا کرتا تھا۔ کچھ لوگ اسے پیار' احترام یا شفقت کی وجہ سے شیخو بابا بھی پکارتے تھے۔ وہ شہنشاہ جہاں گیر کے خطاب اور لقب سے بھی دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ جہاں گیر کے حوالے سے عدل جہاں گیری بھی عوام و خواص میں اب تک ایک پسندیدہ موضوع ہے۔ اس نے محل کے باہر سونے کی زنجیر لٹکا رکھی تھی۔ مظلوم اسے ہلا کر شہنشاہ سے انصاف طلب کر سکتے تھے۔ اس کا پڑ دادا ظہیر الدین بابر مغلیہ خاندان کا بانی تھا۔ وہ سمرقند' بخارا اور خرغانہ کے علاقوں میں لڑتا ہوا ہندوستان آیا اور اس پر قابض ہو گیا۔

بابر کا پڑ پوتا جہاں گیر 1605ء میں ہندوستان کا فرماں روا بنا۔ اس میں یہ خوبی تھی کہ وہ شکار کا رسیا اور دل دادہ تھا۔ مرنے سے کچھ دن پہلے وہ وادی کشمیر میں تھا اور وہاں وہ اپنی یادداشتیں لکھواتا تھا۔ پھر اس کی حالت بگڑ گئی تو اس نے یادداشتیں لکھوانا بند کر دیا۔ ان یادداشتوں کو بعد میں تزک جہاں گیری کے نام سے یاد کیا گیا۔ تزک فارسی کا لفظ ہے اور مطلب ہے وہ یادداشتیں جو بادشاہ خود لکھے یا لکھوائے۔ اسے انگریزی میں میمائرز (MEMOIRS) کہا جاتا ہے۔ انگریز مورخ ہیر لڈ لیمب اپنی کتاب "نور محل" میں لکھتا ہے۔

"وادی کشمیر میں پہنچ کر جہاں گیر نے شکار کا ارادہ کیا۔ وہ زین پر نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اس لیے شکاریوں کو ہانکے کے لیے قرب و

جوار کی پہاڑیوں میں بھیجا گیا اور جہاں گیر ایک بندوق لے کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ جونہی ہرن دکھائی دی' اس نے بندوق داغ دی۔ اچانک چیخوں کی آواز سنائی دی۔ جہاں گیر نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا کہ ایک غلام چٹان سے کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح لڑھک کر نیچے آگرا ہے۔ مغل شہنشاہ کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے حکم دیا کہ مابدولت کو شاہی خیمے میں پہنچادیا جائے"۔ شاہی خیمے کے اندر وہ اپنی مسہری پر لیٹا بمشکل سانس لے رہا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں پر رعشہ طاری تھا۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شہنشاہ جہاں گیر کا شکار کا شوق کس قدر شدید تھا۔ وہ مر رہا تھا اس کے باوجود وہ بندوق لے کر چٹان پر جا بیٹھا تاکہ ہرن شکار کر سکے۔ وہ وادی کشمیر کے اپنے اس آخری سفر میں بارہ دری میں بیٹھ کر گھنٹوں مرغابیوں کے شکار کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔

شہنشاہ جہاں گیر نے 1605ء میں ہندوستان کی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ آگرہ اس کا دارالحکومت تھا۔ اس وقت آگرہ کے اردگرد جنگل بھی تھے اور دریا بھی۔ ویسے وہ سمندر کے ساحل سے لے کر نیپال' کشمیر' افغانستان اور بلوچستان جہاں چاہتا شکار کھیل سکتا تھا اور کھیلتا تھا۔ اس نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ اس نے کانگڑہ کی پہاڑیوں میں بھی شکار کا شوق پورا کیا۔ اس شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے دو چیتے پال رکھے تھے جن کے ذریعے وہ اکثر شکار کرتا تھا۔ اس نے ہتھیار اٹھانے کے لیے ایک اسلحہ بردار بھی ملازم رکھا ہوا تھا جو ایک ہندو تھا۔ اس کا نام انوپ رائے تھا۔ جہاں گیر شیر کے شکار کا تو بے حد شوقین تھا۔ شیر کے شکار کا ایک واقعہ مشہور ہے۔

ایک روز بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ آگرہ کے قریب گھنے جنگل میں شیر کا شکار کیا جائے۔ چناں چہ وہ چیتوں' اسلحہ بردار ہانکے والوں' درباریوں اور دوسرے لوگوں کو لے کر جنگل میں اتر گیا۔ شکار نظر آتا تو سدھائے ہوئے چیتے لپک کر اس کا پیچھا کرتے اور اسے دبوچ لیتے۔ ایک دن وہ شکار کھیل رہا تھا تو ایک درباری بھاگا بھاگا آیا اور بولا۔ "حضور! میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جان بچ گئی"

"کس سے جان بچ گئی تیری؟" شہنشاہ جہاں گیر نے دل چسپی سے پوچھا۔

"حضور کا اقبال بلند ہو' شیر سے" درباری ہکلاتا ہوا بولا۔

"تجھے معلوم ہے مابدولت کو شیر کے شکار سے خاصی دل چسپی ہے۔ کہاں ہے شیر؟ ہم اس کا شکار کریں گے"

"جہاں پناہ' میں ہانکے والوں کے ساتھ تھا۔ پھر میں تیزی میں ان سے آگے نکل گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک درخت پر کچھ چیلیں بیٹھی ہیں۔ میں نے سوچا یہاں کہیں ضرور شکار ہو گا۔ تیر کمان میرے پاس تھے۔ میں نے چلا چڑھایا اور کمان کھینچ کر آہستہ آہستہ اس درخت کی جانب بڑھا جس پر چیلیں بیٹھی تھیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بیل مرا پڑا ہے جس کا آدھا جسم درندوں نے کھالیا ہے۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک شیر میرے سامنے آیا۔ اس نے نیم خوردہ بیل کو دیکھا اور گھنے جنگل کی طرف چل دیا۔ میں بھاگا اور جا کر ہانکے والوں کو بتایا۔ انہوں نے جنگل کے اس حصے کو گھیر لیا ہے جس میں شیر گھسا تھا۔ توجہ فرمایئے۔ ہانکے والوں کی آوازیں آرہی ہیں"۔

جہاں گیر نے اسی وقت حکم دیا کہ چیتوں کے گلوں میں زنجیریں ڈال دی جائیں اور انہیں ان کے محافظوں کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ خود پانچ چھ شکاریوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر اس طرف روانہ ہوا جس طرف ہانکے والے شیر کو گھیرے ہوئے تھے۔ سورج جنگل کی پشت پر تھا اور اس کے ڈوبنے میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ شیر تاڑ کے درخت کے گھنے سائے کے نیچے کھڑا تھا۔ جہاں گیر اپنی بندوق سنبھال کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے نے شیر کو دیکھا تو بدکا۔ گھوڑا بدکتے ہی جہاں گیر زین سے لڑھکا اور نیچے آگرا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور قریب ہی ایک ٹیلے پر چڑھ گیا تاکہ شیر کا نشانہ بنا سکے۔ بادشاہ نے گولی چلائی لیکن اندھیرا تھا۔ نشانہ خطا گیا۔ دوسری بار شیر کا نشانہ لیا تو وہ بھی اندھیرے ہی کی وجہ سے خطا ہوا۔ اب کے شیر نے اپنے قریب آنے والے ایک درباری پر پنجہ مارا اور اسے ہلاک کر دیا۔ بادشاہ نے انوپ رائے کو حکم دیا کہ وہ

دوسری بندوق لائے۔ اس نے دوسری بندوق فوراً بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ اس نے وہ بندوق بادشاہ کے سامنے تپائی پر رکھی اور خود تپائی کو تھامے رکھا۔ شیر اب غصے میں تھا۔ زور زور سے دھاڑ رہا تھا اور برابر چکر کاٹ رہا تھا۔ بادشاہ نے گولی چلائی جو خطا گئی۔ جب بادشاہ نے نئی بندوق سے دوسری گولی چلائی تو شیر نے ٹیلے کے ارد گرد کھڑے درباریوں اور دوسرے لوگوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن گولی شیر کے جبڑوں اور دانتوں کو زخمی کر چکی تھی۔ لوگ ڈر کر ادھر ادھر بھاگے اور جہاں گیر کو روندتے چلے گئے۔ لیکن انوپ رائے نہ ڈرا۔ اس نے شیر کے سر پر لاٹھی سے وار کیا۔ شیر نے اس کی کلائی دانتوں میں بھینچ لی۔ وہ زمین پر گر پڑا لیکن دو درباری اس کی مدد کو آئے۔ انہوں نے تلواروں سے شیر پر حملہ کیا اور انوپ رائے شیر کے منہ سے کلائی نکالنے میں کام یاب ہوا۔ اب دونوں میں کشتی ہونے لگی۔ کبھی شیر اوپر اور انوپ رائے نیچے اور کبھی انوپ رائے اوپر اور شیر نیچے۔ پھر وہ دونوں لڑھکتے لڑھکتے ٹیلے سے نیچے جا گرے اور جہاں گیر جسے درباریوں نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا اس کشتی کو دل چسپی سے دیکھتا رہا۔ اسی دوران میں ایک ہانکے والا قریب سے گزرا تو شیر نے انوپ رائے کو چھوڑ کر اس پر پنجہ مارا اور ہلاک کر دیا۔ انوپ رائے کو اس وقفے سے فائدہ پہنچا۔ اس نے تلوار لے کر شیر پر حملہ کر دیا اور تلوار کی نوک شیر کی آنکھوں میں گھونپ کر اسے اندھا کر دیا۔ ہتھیار بند لوگ اب آگے بڑھے اور انہوں نے برچھے مار مار کر شیر کو ہلاک کر دیا۔ اس شکار میں جہاں گیر کو کوئی زخم نہ آیا۔ وہ شیر کے شکار سے بے حد لطف اندوز ہوا اور انوپ رائے کو بہت سارے انعام سے نوازا کہ اس نے بہت دلیری اور بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔

***

شرارتی لکیریں

شاہد ریاض شاہد

Sharjeel Ahmed

میچ دیکھتے دیکھتے ان بے چاروں کا کیوں میچ ڈال دیا

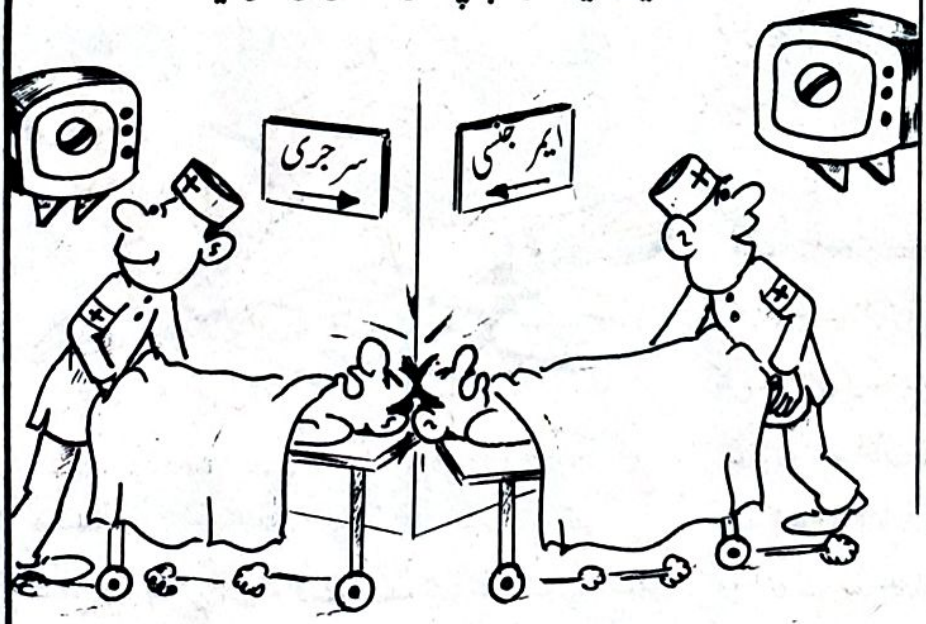

کیوں؟

عبدالستار خان طاہر

Sharjeel Ahmed

اندھیرے میں اچھی طرح نظر کیوں نہیں آتا؟

تیز دھوپ میں ہماری آنکھوں کی پتلیاں چھوٹی ہو جاتی ہیں اور جب ہم اچانک اندھیرے میں جاتے ہیں تو وہ اتنی جلدی سے اپنی اصلی یعنی نارمل حالت میں نہیں آسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اندھیرے میں تھوڑی دیر ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکتے۔ جب تک کہ وہ اپنی اصلی حالت میں نہ آجائیں۔ جب وہ اپنی اصلی حالت میں آجاتی ہیں تو ہم اندھیرے میں بھی دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

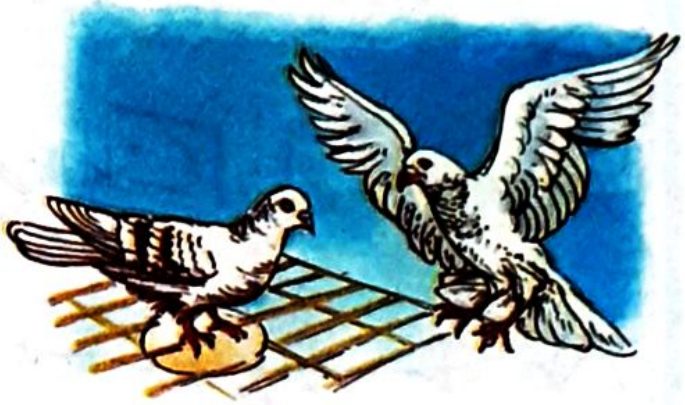

پرندے اپنا راستہ کیوں نہیں بھولتے؟

اہم اکثر اس بات کو نوٹ کرتے ہیں کہ مختلف پرندے اپنے اپنے ٹھکانوں سے بہت زیادہ دور نکل جانے کے باوجود بھی شام کو اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ آتے ہیں اور اپنے گھونسلوں کا راستہ نہیں بھولتے۔ اسی طرح موسمی پرندے بھی ہزاروں میل کے فاصلے سے اڑ کر آتے ہیں اور جب موسم کا اختتام ہوتا ہے تو واپس اپنے مقام کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور ٹھیک ٹھیک اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ ان پرندوں کی تیز بینائی اور تیز فہمی ہے کہ یہ دور دراز جا کر بھی اپنے راستے کو نہیں بھولتے اور مہینوں بعد بھی واپس اپنے اصل ٹھکانے پر آجاتے ہیں۔

قطب نما کی سوئی ہمیشہ شمال کی طرف کیوں رہتی ہے؟

قطب نما ایک آلہ ہے جو بحری جہاز رانوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ وہ اس کی مدد سے سمندر میں اپنی سمت معلوم کرتے ہیں۔ ورنہ اس کے بغیر وہ اپنے درست راستے سے بھٹک سکتے ہیں۔ قطب نما کی سوئی ہمیشہ شمال کی طرف ہی رہتی ہے۔ اب آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ وہ سوئی شمال کی طرف ہی کیوں رہتی ہے اور کسی سمت کی طرف کیوں نہیں مڑتی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ زمین کے دونوں قطب مقناطیسی طاقت سے بھرپور ہیں۔ قطب نما میں جو لوہا ہوتا ہے وہ مقناطیس سے متاثر ہوتا ہے اور اس میں وہی کھچاؤ پیدا ہوتا ہے جو جنوبی قطب کے مقناطیس میں لہٰذا یہی وجہ ہے کہ قطب نما کی سوئی شمالی قطب سے کھینچ کر ہمیشہ شمال کی طرف ہی رہتی ہیں۔

ہمیں مختلف ذائقے کیوں محسوس ہوتے ہیں؟

جب ہم کوئی چیز کھاتے ہیں یا پیتے ہیں تو ہمیں فوراً پتا چل جاتا ہے کہ وہ چیز کڑوی ہے یا میٹھی یا ترش۔ اس کو ہم ذائقہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں چیز کا ذائقہ ہے۔ ذائقے کا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہماری زبان کو پتا چلتا ہے۔ اصل میں زبان کے اوپر ٹیسٹ بڈز ہوتے ہیں' جنہیں ذائقے کا پتا چلتا ہے۔ ان ٹیسٹ بڈز کا بہت ہی باریک نسوں کے ذریعے دماغ کے ساتھ

تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح الگ الگ ذائقے کے لیے الگ الگ اعصاب ہوتے ہیں جو اس چیز کے جو ہم نے کھائی یا پی ہے' ذائقے کے احساس کی اطلاع فوراً دماغ کو دے دیتے ہیں۔

مکھیاں چھت پر الٹی لٹکتی ہیں تو گرتی کیوں نہیں؟

کبھی آپ نے غور کیا کہ یہ ہماری گھریلو مکھیاں چھت پر الٹی کیسے چلتی ہیں اور یہ نیچے کیوں نہیں گرتیں۔ اصل میں وجہ یہ ہے کہ مکھیوں کے پاؤں کے تلوے نیچے سے گدی نما ہوتے ہیں جو درمیانی حصے میں قریب قریب کھوکھلے ہوتے ہیں۔ مکھیاں چھت پر الٹی لٹکتی ہیں تو اس وقت ان کے پاؤں کے تلووں کی درمیانی کھوکھلی جگہ کی ہوا نکل جاتی ہے اور ان کے پاؤں کے تلوے ہوا سے خالی ہونے کی وجہ سے چھت سے چپک جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکھیاں چھت پر الٹی لٹکی ہونے کے باوجود نیچے نہیں گرتیں۔

آنسو کیوں بہتے ہیں؟

جب آپ کو کبھی آپ کے پاپا یا مما کسی غلطی پر مارتے ہیں یا آپ کی بہنا اور بھائی ڈانٹتے ہیں تو فوراً آپ اپنا پورا منہ کھول کر بڑے زور و شور سے رونے لگتے ہیں اور آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات بہنے لگتی ہے۔ کبھی آپ نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ بھلا یہ ہماری آنکھوں سے آنسو بہتے ہی کیوں ہیں۔ اصل میں آنسوؤں کے بہنے کی وجہ یہ ہے کہ جب ہمیں کوئی جسمانی یا ذہنی تکلیف پہنچتی ہے تو اس تکلیف کی وجہ سے ہمارے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ان غدودوں میں جو آنکھوں کو تر رکھنے کے لیے ہوتے ہیں' ایک حرکت پیدا ہوتی ہے اور جب یہ حرکت زور پکڑتی ہے تو ہماری آنکھوں اور ناک سے پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے بہنے لگتے ہیں۔ اسی کو ہم رونا کہتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ماہرین کی رائے کے مطابق رونا ہمارے لیے فائدہ مند ہے۔ کیوں کہ آنسوؤں سے اجتماع خون میں کمی واقع ہوتی ہے اور اس سے دل کو سکون ملتا ہے لیکن بھئی ہماری اس بات کو پڑھ کر رونے کو کہیں مشغلہ ہی نہ بنا لینا۔ کیوں کہ اتنا رونا بھی اچھا نہیں کہ سارے آپ کو رونی صورت ہی کہنا شروع کر دیں۔

ہمیں نیند کیوں آتی ہے؟

ڈاکٹر پریر کہتے ہیں کہ سارا دن کام کاج کرنے سے ہمارے جسم میں تیزابی خواص والا فضول مواد جمع ہو جاتا ہے۔ جس کے اثر سے ہمارے جسم کی حرکت سست پڑ جاتی ہے اور ہمیں تھکاوٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ ڈاکٹر فلوجر کا کہنا ہے کہ دن کے وقت دماغ کے خلیوں میں آکسیجن ختم ہو جاتی ہے کیوں کہ دماغ کے کام کرنے کی رفتار ہمارے جسم میں آکسیجن کے جمع ہونے کی رفتار سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے جب آکسیجن ختم ہو جاتی ہے تو ہم پر بیرونی محرکات بہت کم اثر پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں نیند آجاتی ہے۔ ڈاکٹر پائرن کا کہنا ہے کہ سارا دن دماغی کام کرنے سے ہمارے دماغ میں ایک زہر سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے اس کی مقدار آخر کار اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہ دماغ میں ایک خمار سا پیدا کر دیتی ہے۔ جس سے ہمیں نیند آنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر ہوئل کے خیال کے مطابق ہمیں نیند اس وقت آتی ہے جب ہمارے دماغ میں خون کا دوران کم ہو جاتا ہے۔

Sharjeel Ahmed

نجمہ معراج

بہترین مقابلے

اسوہ کی نانی امی اور نانا ابو گاؤں میں رہتے تھے اور وہ بھی اپنے امی ابو کے ساتھ گاؤں میں ہی رہتی تھی۔ البتہ اسوہ کے ماموں کو اپنی بچی محمدہ کے تعلیم کے سلسلے میں اپنی رہائش گاؤں سے شہر لے جانا پڑی تھی۔ وہ کرائے پر مکان لے کر سب افراد خانہ کے ساتھ فیصل آباد منتقل ہوگئے تھے۔

محمدہ کے والد کو شہر آئے ہوئے دو سال ہوئے تھے۔ محمدہ نے ساتویں کلاس کے پیپر دیئے تو اسے اب اسکول سے دس بارہ چھٹیاں تھیں۔ لہٰذا محمدہ اور اس کے امی ابو نیز دادی اور دادا جان اسوہ کے گاؤں جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ کافی دل چسپ سفر کے بعد جب گاؤں پہنچے تو اپنے عزیزوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ البتہ اسوہ کی والدہ کچھ خاموش اور پریشان تھی۔ اسوہ کی نانی اماں نے پوچھا "بیٹی اسوہ اب کون سی جماعت میں ہے"۔

اسوہ کی والدہ نے یہ سن کر بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ بیٹی کو روتے دیکھ کر ماں پریشان ہوگئی اور جلدی میں پوچھنے لگی۔ "کیا بات ہے بیٹی رو کیوں رہی ہو؟ کہیں اسوہ خدانخواستہ فیل تو نہیں ہوگئی یا اس نے پڑھنا تو نہیں چھوڑ دیا"۔

"نہیں امی جان' نہ ہی اسوہ نے پڑھنا چھوڑا ہے اور نہ ہی وہ فیل ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے پیپر بہت اچھے ہوئے ہیں۔ مگر میں اب اس کی پڑھائی کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔ اس کے ابا جان کہتے ہیں کہ اسے شہر پڑھنے کے لیے ہرگز نہیں بھیجنا۔ ان کا کہنا ہے کہ بچیوں کو اکیلے اتنی دور نہیں جانا چاہیے لہٰذا اس سلسلے میں میں بہت پریشان ہوں"۔

یہ باتیں سن کر اسوہ کے ماموں بولے "نہ بہن' یہ تو بہت بری بات ہے کہ اسوہ کو آگے تعلیم نہ دلوائی جائے۔ آپ اسے ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ یہ محمدہ کے ساتھ اسکول چلی جایا کرے گی"۔

یہ بات سن کر اسوہ کی امی اور اسوہ دونوں بہت خوش ہوئے۔ اسوہ کے ابو سے بات کی گئی تو انہوں نے بھی ماموں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ اب اسوہ نے ان کے ساتھ فیصل آباد جانے کی تیاری کرلی۔ پھر دس روز بعد وہ خوشی

خوشی اسوہ کو لے کر فیصل آباد آ گئے۔

اسوہ کے فیصل آباد آنے پر سب سے زیادہ بچے خوش تھے۔ اسوہ اور محمدہ کو یہ خوشی تھی کہ وہ ایک ساتھ اسکول جایا کریں گی اور مل کر پڑھا اور کھیلا کریں گی۔ ان کے گھر میں سیمی نام کی ایک لڑکی کام کرتی تھی۔ اس کے والدین آج سے چار سال پہلے وفات پا گئے تھے۔ اسوہ کے ماموں نے اسے صرف نوکرانی بنا کر نہیں رکھا ہوا تھا بلکہ اس کی تعلیم اور پرورش کی ذمہ داری بھی اپنے ذمے لی ہوئی تھی۔ اب وہ چوتھی جماعت میں تھی مگر عمر میں اسوہ اور محمدہ دونوں سے بڑی تھی۔ وہ بھی اسوہ کی آمد پر دلی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ جب کہ اسوہ کے نانا جان اور نانی جی کو تو سب سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ اسوہ کی امی جب اسوہ کو ملنے آیا کرے گی تو اس بہانے ان کی بھی اپنی بیٹی سے ملاقات ہو جایا کرے گی۔

اسوہ کو بھی محمدہ کے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اسوہ کے ماموں دفتر جاتے ہوئے دونوں کو اسکول چھوڑ دیتے اور واپسی پر ان کو اسکول سے ساتھ لے کر گھر آ جاتے۔ محمدہ کو قرآن مجید پڑھانے کے لیے ایک بی بی جی ان کے گھر آتی تھیں۔ سیمی بھی انہی سے قرآن مجید پڑھتی تھی اور اب اسوہ نے بھی انہی سے قرآن شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ جلد ہی بی بی جی سے بے تکلف ہو گئی۔

کچھ تو اسوہ بڑوں کے ادب سے پہلے ہی واقف نہ تھی دوسرے یہاں پر نانی کے لاڈ پیار نے اسے اور زیادہ بگاڑ دیا۔ جی کہ کر تو اس نے کبھی اپنی امی اور ابو کو بھی مخاطب نہ کیا تھا۔ گھر میں اس کی جو تھوڑی بہت تربیت اور روک ٹوک ہوتی تھی یہاں آ کر وہ بھی ختم ہو گئی۔ اسے کوئی اس خوف سے کچھ نہیں کہتا تھا کہ کہیں وہ اداس نہ ہو جائے۔ بی بی جی کو اسوہ کا اپنی امی جان کو امی اور نانی جان کو نانی کہ کر مخاطب کرنا بالکل پسند نہیں آتا تھا بلکہ انہیں اس پر بہت غصہ آتا تھا۔ ایک دن بی بی جی نے اسوہ کی اسی طرح کی بے ادبی اور گستاخی کی باتیں سن کر بے اختیار کہا "اف یہ بچی پڑھے گی خاک، اسے تو بولنا بھی نہیں آتا"۔

اس دن بی بی جی نے قرآن پاک کو کھول کر سبق پڑھانے کے بجائے قرآن حکیم کو واپس الماری میں رکھ دیا اور اسوہ سے مخاطب ہو کر بولیں "دیکھو اسوہ بیٹی، اگر تمہاری جگہ میری اپنی بیٹی اس طرح گفت گو کر رہی ہوتی یا محمدہ اس طرح گفت گو کرتی تو میں اسے بہت پیٹتی۔ تمہیں میں نے اس لیے نہیں مارا کہ تم یہاں مہمان آئی ہوئی ہو۔ لیکن سنو، تم نے یہاں کوئی دو چار دن تو نہیں رہنا نا۔ یہاں تو تم پڑھنے آئی ہو، کچھ سیکھنے آئی ہو۔ نہ کہ جو سیکھا ہوا ہے اسے بھی بھلانے۔ دیکھو اسوہ، تم اپنے والدین کا بالکل احترام اور ادب نہیں کرتی۔ حال آں کہ یہ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اپنے والدین کی عزت کریں اور انہیں ادب سے مخاطب کریں اور ان کی ہر خواہش کا احترام کریں۔

تمہاری نانی جان اور نانا جان تو تمہاری والدہ کے والدین ہیں۔ ان کا تو آپ کو اور بھی زیادہ احترام اور ادب کرنا چاہیے۔ آج سے میری یہ بات پلے باندھ لو کہ یہ گھر تمہارے لیے درس گاہ ہے۔ تمہارے والدین نے تمہاری جدائی برداشت کر کے تمہیں شہر میں پڑھنے اور کچھ سیکھنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہاں

رہ کر تمہارا خوب دل لگا کر پڑھنا اور اچھے اچھے کام سیکھنا بھی والدین کی خواہشات کا احترام کرنا ہے۔ لہٰذا سیکھو پڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑوں کا ادب کرنا بھی سیکھیں۔

اسی دوران میں اسوہ نے محمدہ کو پنسل سے چھیڑا۔ بی بی جی کو یہ بات بھی ناگوار گزری اور وہ تھوڑا زور سے بولیں "اسوہ میری بات غور سے سنو' میں بہت دنوں سے تمہاری بے ہودہ عادتیں برداشت کر رہی تھی۔ مجھے بھی بی بی کہ کر پکارتی ہو۔ اپنی گفت گو میں جی کو شامل کر لو۔ اپنے سے بڑے بلکہ چھوٹے کو بھی مخاطب کرتے وقت تمہیں جی کا استعمال ضرور کرنا چاہیے"۔

اسوہ نے اپنے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمودار کرتے ہوئے کہا "چھوٹوں کو تو نوکرانیاں جی کہتی ہیں جیسے سیمی مجھے اسوہ جی اور محمدہ کو محمدہ جی کہ کر بلاتی ہے"۔

"نہیں بیٹی' ایسی بات ہر گز نہیں" بی بی جی بولیں "ادب اور احترام کرنا صرف نوکرانیوں پر فرض نہیں بلکہ عزت اور احترام' محبت اور شفقت سے پیش آنا تمام عظیم لوگوں کا شیوہ ہے۔ اور ہاں بیٹی ایک بات اور سنو' کسی مشکل وقت کے علاوہ کبھی اپنے سے بڑے سے اپنا کام نہیں کروانا چاہیے۔ بلکہ خود والدین اور اپنے سے بڑوں کا کام کرنا چاہیے۔ کل تمہیں اپنی نانی اماں سے پانی مانگنے کے بجائے خود اٹھ کر پینا چاہیے تھا۔ بلکہ نانی اماں کو بھی جب وہ ضرورت محسوس کریں پانی پلایا کرو اور اپنے کپڑے خود دھویا کرو بلکہ اپنی نانی امی اور نانا ابو کے بھی دھویا کرو۔ یہ بھی ان کے احترام میں شامل ہے"۔

"اور بی بی جی بڑوں کو آہستہ آواز میں بلانا چاہیے نا جی' اسوہ جی نانی جی کو جی بڑی اونچی آواز میں بلاتی ہیں جی" سیمی نے کہا۔

"بہت غلط بات ہے' یہ میں نے بھی نوٹ کیا ہے" بی بی جی نے کہا "دراصل بڑوں اور خاص طور پر والدین کا احترام ہی جنت کا راستہ ہے۔ میں آپ کو دین کی چند باتیں اور پیارے نبیؐ کی چند احادیث بتاتی ہوں جو والدین کے احترام اور ادب کے بارے میں ہیں۔ مجھے امید ہے تم غور سے سنو گی اور ان پر عمل بھی کرو گی"۔

"خدا کے بعد انسان پر سب سے زیادہ حق ماں باپ کا ہی ہے۔ ماں باپ کے حق کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے کرو کہ قرآن پاک نے جگہ جگہ ماں باپ کے حق کو خدا کے حق کے ساتھ بیان کیا ہے اور خدا کی شکر گزاری کی تاکید کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی شکر گزاری کی تاکید کی ہے۔

ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا "میں آپؐ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کے لیے بیعت کرتا ہوں اور خدا سے اس کا اجر چاہتا ہوں۔ نبیؐ نے پوچھا "کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہے۔ اس نے کہا "جی ہاں بلکہ (خدا کا شکر ہے) دونوں زندہ ہیں"۔

آپؐ نے فرمایا "تو کیا تم واقعی خدا سے اپنی ہجرت اور جہاد کا بدلہ چاہتے ہو"۔

اس نے کہا "جی ہاں میں خدا سے اجر چاہتا ہوں"

نبیؐ نے ارشاد فرمایا "تو جاؤ اپنے ماں باپ کی خدمت میں رہ کر ان کے ساتھ نیک سلوک کرو"

اسی طرح ایک بار ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا "یا رسول اللہ ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟"

ارشاد فرمایا "ماں باپ ہی تمہاری جنت ہیں اور ماں باپ ہی دوزخ"

یعنی ان کے ساتھ نیک سلوک کر کے تم جنت کے مستحق ہو گے اور ان کے حقوق کو پامال کر کے تم جہنم کا ایندھن بنو گے۔ والدین ہی کی پرورش اور نگرانی میں ہم پلتے بڑھتے اور شعور کو پہنچتے ہیں اور وہ جس غیر معمولی قربانی' بے مثل جان فشانی اور انتہائی شفقت سے ہماری سرپرستی فرماتے ہیں' اس کا تقاضا ہے کہ ہمارا سینہ ان کی عقیدت و احسان مندی اور عظمت و محبت سے سرشار ہو اور ہمارے دل کا ریشہ ریشہ ان کا شکر گزار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنی شکر گزاری کے ساتھ ساتھ ان کی شکر گزاری کی تاکید فرمائی ہے۔

ہمیں ماں باپ کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان کی مرضی اور مزاج کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کہنی چاہیے۔ بالخصوص بڑھاپے میں جب مزاج کچھ چڑچڑا ہو جاتا ہے اور والدین ایسے تقاضے اور مطالبے کرنے لگتے ہیں جو

توقع کے خلاف ہوتے ہیں' اس وقت بھی ہر بات کو خوشی خوشی برداشت کرنا چاہیے اور ان کی کسی بات سے اکتا کر جواب میں کوئی ایسی بات ہر گز نہیں کہنی چاہیے جو ان کو ناگوار ہو اور ان کے جذبات کو ٹھیس لگے۔

دراصل بڑھاپے کی عمر میں بات کی برداشت نہیں رہتی اور کم زوری کے باعث اپنی اہمیت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے ذرا ذرا سی بات بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا اس نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے کسی قول و عمل سے ماں باپ کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ نبیؐ نے ارشاد فرمایا "خدا کی خوش نودی والد کی خوش نودی میں ہے۔ خدا کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے"۔

یعنی اگر کوئی شخص خدا کو خوش رکھنا چاہے تو وہ اپنے والد کو خوش رکھے۔ والد کو ناراض کر کے خدا کو خوش نہیں کیا جا سکتا۔ جو والد کو ناراض کرے گا وہ خدا کے غضب کو بھڑکائے گا۔ اس لیے ہمیں دل و جان سے ماں باپ کی خدمت کرنی چاہیے۔ اگر ہمیں خدا نے اس کا موقع دیا ہے تو دراصل یہ اس بات کی توفیق ہے کہ ہم خود کو جنت کا مستحق بنا سکیں اور خدا کی خوش نودی حاصل کر سکیں۔ ماں باپ کی خدمت سے ہی دونوں جہاں کی بھلائی سعادت اور عظمت حاصل ہوتی ہے اور آدمی دونوں جہاں کی آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

"جو آدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کی عمر دراز کی جائے اور اس کی روزی میں کشادگی ہو' اس کو چاہیے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے اور صلہ رحمی کرے"۔

نبی ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے:

"وہ آدمی ذلیل ہو' پھر ذلیل ہو' پھر ذلیل ہو"

لوگوں نے پوچھا "اے خدا کے رسولؐ' کون آدمی؟"

آپؐ نے فرمایا "وہ آدمی جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پایا' دونوں کو پایا یا کسی ایک کو اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا"۔

پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک بار دو آدمیوں کو دیکھا اور ایک سے پوچھا "یہ دوسرے تمہارے ساتھ کون ہیں؟"

اس نے کہا "یہ میرے والد ہیں"۔ آپؓ نے فرمایا۔ "دیکھو نہ ان کا نام لینا' نہ کبھی ان سے آگے چلنا اور نہ کبھی ان سے پہلے بیٹھنا"۔

والدین کے ساتھ عاجزی اور انکساری سے پیش آنا

چاہیے اور عاجزی اور نرمی سے ان کے سامنے بچھے رہنا چاہیے۔ عاجزی سے بچھے رہنے سے مراد یہ ہے کہ ہر وقت مرتبے کا لحاظ رکھا جائے اور کبھی ان کے سامنے اپنی بڑائی نہ جتائی جائے اور نہ ان کی شان میں گستاخی کی جائے۔

ہمیں اپنے والدین سے محبت کرنی چاہیے اور اس کو اپنے لیے باعث سعادت اور اجر آخرت سمجھنا چاہیے۔ ہمارے پیارے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ جو نیک اولاد بھی ماں باپ پر محبت بھری ایک نظر ڈالتی ہے اس کے بدلے خدا اس کو ایک حج مقبول کا ثواب بخشتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا۔ "اے خدا کے رسولؐ، اگر کوئی ایک دن میں سو بار اسی طرح رحمت و محبت کی نظر ڈالے؟" آپؐ نے فرمایا "جی ہاں، اگر کوئی سو بار ایسے کرے۔ تب بھی خدا تمہارے تصور سے بہت بڑا اور تنگ دلی جیسے عیبوں سے بالکل پاک ہے"۔

پھر بی بی جی نے سب کو مخاطب کر کے کہا "بیٹیو، ان اچھی اچھی باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری عافیت اسی میں ہے کہ ہم ماں باپ کی دل و جان سے اطاعت کریں۔ اگر وہ کچھ زیادتی بھی کر رہے ہوں تب بھی خوش دلی سے اطاعت کریں اور ان کے عظیم احسانات کو پیش نظر رکھ کر ان کے وہ مطالبے بھی خوشی خوشی پورے کریں جو ہمارے ذوق و مزاج پر گراں ہوں۔ شرط یہ کہ وہ دین کے خلاف نہ ہوں۔

پھر بی بی جی نے کہا "اولاد کو چاہیے کہ وہ ماں باپ کو اپنے مال کا مالک سمجھے اور ان پر دل کھول کر خرچ کرے۔ ایک بار نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور اپنے باپ کی شکایت کرنے لگا کہ وہ جب چاہتے ہیں میرا مال لے لیتے ہیں۔ نبی ﷺ نے اس آدمی کے باپ کو بلوایا تو لاٹھی ٹیکتا ہوا ایک بوڑھا کم زور شخص حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس بوڑھے شخص سے تحقیق فرمائی تو اس نے کہنا شروع کیا۔

"خدا کے رسولؐ! ایک زمانہ تھا جب یہ کم زور اور بے بس تھا اور مجھ میں طاقت تھی۔ میں مال دار تھا اور یہ خالی ہاتھ تھا۔ میں نے کبھی اس کو اپنی چیز لینے سے نہیں روکا۔ آج میں کم زور ہوں اور یہ تن درست ہے۔ میں خالی ہاتھ ہوں اور یہ مال دار ہے۔ اب یہ اپنا مال مجھ سے بچا بچا کر رکھتا ہے"۔

بوڑھے کی یہ باتیں سن کر رحمت عالمؐ رو پڑے اور بوڑھے کے لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے"

خدا کا ارشاد ہے "اور دعا کرو کہ پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح ان دونوں نے بچپن میں میری پرورش فرمائی تھی"۔

یعنی اے پروردگار بچپن کی بے بسی میں جس رحمت و جاں فشانی اور شفقت و محبت سے انہوں نے میری پرورش کی اور میری خاطر اپنے عیش کو قربان کیا، پروردگار اب یہ بڑھاپے کی کم زوری اور بے بسی میں مجھ سے زیادہ خود رحمت و شفقت کے محتاج ہیں۔ خدایا میں ان کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا۔ تو ہی ان کی سرپرستی فرما اور ان کے حال زار پر رحم کی نظر کر۔

پھر بی بی جان نے کہا "بیٹی، ماں کی خدمت کا تو خصوصی خیال رکھا کرو۔ اس کے احسانات اور قربانیاں باپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ اس لیے دین نے ماں کا حق زیادہ بتایا ہے اور ماں کے ساتھ سلوک کی ترغیب دی ہے۔

ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں آیا اور پوچھا "اے خدا کے رسولؐ، میرے نیک سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟" آپؐ نے فرمایا "تیری ماں" اس نے پوچھا "پھر کون ہے؟" "آپؐ نے فرمایا "تیری ماں" اس نے پوچھا "پھر کون ہے؟" ارشاد فرمایا "تیری ماں" اس نے کہا پھر کون؟ "تو آپؐ نے فرمایا تیرا باپ"۔

اسی طرح ایک بار حضرت جاہمہؓ نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "یا رسول اللہ، میرا ارادہ ہے کہ میں آپؐ کے ہم راہ جہاد میں شرکت کروں اور اسی لیے آیا ہوں کہ آپؐ سے اسی معاملے میں مشورہ لوں (فرمایئے کیا حکم ہے)"۔

نبی ﷺ نے ان سے پوچھا "تمہاری والدہ زندہ ہے"۔ جاہمہؓ نے کہا کہ جی ہاں زندہ ہے۔ نبیؐ نے ارشاد فرمایا "تو پھر جاؤ اور انہی کی خدمت میں لگے رہو۔ کیوں کہ جنت انہی کے قدموں میں ہے"۔

حضرت اویسؓ نبیؐ کے دور میں موجود تھے مگر آپؐ کی

ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ ان کی ایک بوڑھی ماں تھیں۔ دن رات انہی کی خدمت میں لگے رہتے۔ نبیؐ کے دیدار کی بڑی آرزو تھی اور کون مومن ہوگا جو اس تمنا میں نہ تڑپتا ہو کہ اس کی آنکھیں دیدار رسولؐ سے روشن ہوں۔ چناں چہ حضرت اویسؒ نے آنا بھی چاہا لیکن نبیؐ نے منع فرمایا۔ فریضہ حج ادا کرنے کی بھی ان کے دل میں بڑی آرزو تھی لیکن جب تک ان کی والدہ زندہ رہیں ان کی تنہائی کے خیال سے حج نہیں کیا اور ان کی وفات کے بعد ہی یہ آرزو پوری ہو سکی۔

"بی بی جی جس کے والدین ہی فوت ہو گئے ہوں وہ کیسے اتنا یادہ اجر اور ثواب کما سکتا ہے جو صرف والدین کی خدمت اور احترام سے حاصل ہو سکتا ہے" سیمی جس کے والدین وفات پا گئے تھے' نے روہانسی صورت بنا کر کہا۔

"بیٹی' اللہ بڑا رحیم اور کریم ہے۔ وہ کسی کو بھی ثواب کمانے کے مواقع سے محروم نہیں رکھتا۔ جن کے والدین حیات نہیں وہ چاہیں تو ان بچوں سے بھی زیادہ ثواب کما سکتے ہیں جن کے والدین حیات ہیں" بی بی جی نے سیمی کے سر پر شفقت سے

ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"والدین کی وفات کے بعد بھی ان کا خیال رکھا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ہمیں ماں باپ کے لیے مغفرت کی دعائیں برابر کرتے رہنا چاہیے۔ قرآن پاک نے مومنوں کو یہ دعا سکھائی ہے۔

"پروردگار! میری مغفرت فرما اور میرے والدین کی اور سب ایمان لانے والوں کو اس روز معاف فرما دے جب کہ حساب قائم ہوگا"۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ مرنے کے بعد جب میت کے درجات بلند ہوتے ہیں تو وہ حیرت سے پوچھتی ہے کہ یہ کیوں کر ہوا۔ خدا کی جانب سے اس کو بتایا جاتا ہے کہ تمہاری اولاد تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرتی رہی (اور خدا نے اس کو قبول فرمالیا)۔

ہمیں والدین کی وفات کے بعد والدین کے کئے ہوئے عہد و پیمان اور وصیت کو پورا کرنا چاہیے۔ ماں باپ نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں سے کچھ وعدے کئے ہوں گے۔ اپنے خدا سے کچھ عہد کیا ہوگا۔ کوئی نذر مانی ہوگی' کسی کو کچھ مال دینے کا وعدہ کیا ہوگا۔ ان کے ذمے کسی کا قرضہ رہ گیا ہوگا اور ادا کرنے کا موقع نہ پا سکے ہوں گے۔ مرتے وقت کچھ وصیتیں کی ہوں گی۔ آپ ان کاموں کو پورا کرنے کی پوری پوری کوشش کر سکتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے نبیؐ سے عرض کیا "یارسول اللہ' میری والدہ نے نذر مانی تھی لیکن وہ نذر پوری کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئیں۔ کیا میں ان کی طرف سے یہ نذر پوری کر سکتا ہوں"۔

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا "کیوں نہیں تم ضرور ان کی طرف سے نذر پوری کر دو"

ہمیں باپ کے دوستوں اور ماں کی سہیلیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنا چاہیے۔ ان کا احترام کرنا چاہیے۔ ان کو اپنے مشوروں میں اپنے بزرگوں کی طرح شریک رکھنا چاہیے اور ان کی رائے اور مشوروں کی تعظیم کرنی چاہیے۔

ایک موقع پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سب سے زیادہ نیک سلوک یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کے دوست احباب کے ساتھ بھلائی کرے''۔

ماں باپ کے رشتہ داروں کے ساتھ بھی برابر نیک سلوک کرتے رہنا چاہیے۔ اگر زندگی میں خدانخواستہ ماں باپ کے ساتھ سلوک کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو پھر بھی خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

''اگر کوئی بندہ خدا زندگی میں ماں باپ کا نافرمان رہا اور والدین میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا اسی حال میں انتقال ہو گیا تو اب اس کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کے لیے برابر دعا کرتا رہے اور خدا سے ان کی بخشش کی درخواست کرتا رہے۔ یہاں تک کہ خدا اس کو اپنی رحمت سے نیک لوگوں میں لکھ دے''۔

بی بی جی کی یہ باتیں سن کر اسوہ اور محمدہ پر تو جو اثر ہوا سو ہوا البتہ سیمی بہت متاثر نظر آرہی تھی۔

بی بی جی نے والدین کے احترام سے متعلق گفت گو ختم کر کے اوپر نظریں اٹھا کر تینوں بچیوں کی طرف دیکھا تو وہ اس غور سے بی بی جی کی باتیں سن رہی تھیں کہ گویا انہیں خدانخواستہ سکتہ ہو گیا ہو۔ وہ اپنی پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔ پھر بی بی جی نے کہا ''اچھا بچیو خدا حافظ' سبق ہم کل ہی پڑھیں گے''۔

بی بی جی اس کے بعد چار روز تک پڑھانے نہ آئیں۔ بچے روزانہ انتظار کرتے۔ اسوہ کہہ رہی تھی ''نانی جی پتا نہیں بی بی جی نے آنا کیوں چھوڑ دیا''۔

اسوہ کی نانی بی بی جی پر بہت خوش تھیں کیوں کہ ان کی تبلیغ سے اسوہ کی گویا زندگی ہی بدل گئی۔ اسی لمحے بی بی جی اندر داخل ہوئیں۔ اسوہ نے بڑے احترام سے ''بی بی جی السلام علیکم'' کہا۔

بی بی جی کہنے لگیں ''ماشاء اللہ' بیٹی جیتی رہو۔ تم تو بہت اچھی اور سمجھ دار ہو گئی ہو''۔ اتنے میں اسوہ نے کرسی اٹھا کر بی بی جی کے سامنے بیٹھنے کے لیے رکھ دی۔

پھر بی بی جی نے بتایا کہ وہ اس دن سے بخار میں تپ رہی

تھیں۔ آج کچھ بخار اترا ہے تو آگئی ہیں۔ نانی اماں بی بی جی سے کہنے لگیں ''بہن اللہ تعالیٰ آپ کو تا قیامت سلامت رکھے اور آپ کا بھلا کرے۔ آپ کی باتوں کا تو ہماری اسوہ پر بہت اثر ہو اہے۔ ہم اس کی باتوں سے تنگ تو بہت تھے لیکن اس کے اداس ہو جانے کے ڈر سے اسے کچھ کہتے نہیں تھے''۔

جب اس کی امی جان آئیں تو وہ بھی اسوہ میں یہ حیرت انگیز تبدیلی دیکھ کر بہت حیران اور خوش ہوئیں۔ اب محمدہ اسوہ اور سیمی میں ایک طرح مقابلہ شروع ہو گیا ہے اور یہ مقابلہ ہے والدین اور بڑوں کا احترام کر کے زیادہ سے زیادہ ثواب کمانے کا۔ اللہ کرے ایسے اچھے بلکہ بہترین مقابلے ہر گھر میں موجود بچوں کے درمیان شروع ہو جائیں (آمین)

(اس کہانی کی تیاری میں مولانا محمد یوسف اصلاحی کی کتاب

آداب زندگی سے مدد لی گئی ہے)

Sharjeel Ahmed

مارخور بکریوں سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں لیکن انہیں ان کے بل کھائے ہوئے سینگوں کی وجہ سے با آسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ لفظ مارخور دو الگ الگ فارسی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ پہلا مار یعنی سانپ اور دوسرا خور یعنی کھانا۔ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ مارخوروں پر سال میں ایسا وقت بھی آتا ہے جب خشک ماحول میں کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو یہ سانپ بھی کھا جاتے ہیں۔ بعض لوگ اس لفظ کو پشتو زبان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کے مطابق پشتو میں مار کا مطلب سانپ اور خور کا مطلب سینگ ہوتا ہے۔ یعنی سانپ کی طرح بل دار سینگ والا حیوان۔ لفظ مارخور کی ایک اور وضاحت بھی بتائی جاتی ہے۔ اس وضاحت کے مطابق یہ دو لفظوں مار اور خر سے مل کر بنا ہے جو لکھتے وقت مارخر لکھا جاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق مار کے معنی سانپ اور خر کے معنی گدھے کے ہیں یعنی سانپ جیسے سینگوں والا گدھا۔ بہر حال "مارخور" کی ان تینوں وضاحتوں سے ہی اس چوپائے کی خصوصیات اور شکل و صورت کی وضاحت ہوتی ہے۔

ماخور کے سینگ لمبے اور بھاری ہوتے ہیں۔ یہ سر پر ایک دوسرے سے بالکل قریب سے نکلتے ہیں۔ سینگ پہلوؤں سے اس قدر دبے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کی سامنے والی سطح بہت باریک اور استرے کی دھار کی طرح ہوتی ہے۔ سینگ باہر کی طرف بل کھائے ہوئے ہوتے ہیں اور ماخوروں کی مختلف قسموں میں ان بلوں کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ سامنے والی باریک دھار بھی عمر کے ساتھ ساتھ موٹی ہوتی جاتی ہے لیکن نوعمری میں بہت باریک ہوتی ہے۔ نر مارخوروں کے سینگوں کی زیادہ سے زیادہ لمبائی 165 سینٹی میٹر اور کم سے کم لمبائی ساڑھے اکانوے سینٹی میٹر ہوتی ہے۔

ویسے عام طور پر نر مارخوروں کے سینگوں کی عموماً لمبائی بالغوں میں 150 سینٹی میٹر کہ لگ بھگ ہوتی ہے۔ مادہ مار خوروں کے سینگ نروں کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن ان کی لمبائی کم یعنی ساڑھے پندرہ سے ساڑھے پینتیس سینٹی میٹر کے درمیان ہوتی ہے۔ سینگوں کا عمومی رنگ بھورا ہوتا ہے۔

مارخور مضبوط اور سخت جان نبات خور ہیں۔ یہ دیکھنے میں ایک بڑے قد کی بکری کی طرح نظر آتے ہیں۔ بالغ نروں کا وزن 80 سے 109 کلوگرام تک ہوتا ہے۔ ان کی ٹانگیں چھوٹی اور موٹی اور کھر چوڑے ہوتے ہیں۔ نر اور مادہ دونوں کا رنگ یکساں اور عام طور پر سرخی مائل سلیٹی ہوتا ہے۔ یہی رنگ موسم گرما میں زیادہ زردی مائل اور موسم سرما میں زیادہ سلیٹی ہو جاتا ہے۔ موسم سرما میں ان کے بال لمبے اور ریشمی ہو جاتے ہیں لیکن پشم موجود نہیں ہوتی۔

بالغ نروں میں گلے اور سینے کو گھیرے ہوئے ڈاڑھی موجود ہوتی ہے۔ پہاڑی بکرے کے مقابلے میں مارخور کی ڈاڑھی زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ نوعمر مارخوروں کی ڈاڑھی صرف تھوڑی تک محدود ہوتی ہے۔ شمالی علاقوں میں رہنے والی مادہ مارخوروں میں ٹھوڑی پر بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا ہوتا ہے لیکن بلوچستان میں ملنے والی ماداؤں میں ایسا نہیں ہوتا۔ مارخور کی دم چھوٹی ہوتی ہے جس پر بہت تھوڑے مگر لمبے سیاہ بال ہوتے ہیں۔

بالغ نر اکیلے رہتے ہیں۔ مادائیں بچوں کے ساتھ سارا سال چھوٹے چھوٹے گروہوں میں زندگی گزارتی ہیں۔ ان کے گروہ میں آٹھ نو ارکان ہوتے ہیں لیکن 20 اور 30 ارکان تک کے گروہ بھی دیکھے گئے ہیں۔

مارخور بہت حد تک سخت گرمی اور سخت سردی برداشت کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بہر حال پھر بھی گرمی اور سردی برداشت کرنے کی صلاحیت کے باوجود یہ گرمیوں میں دوپہر کا وقت کسی ٹھنڈی جگہ پر آرام کر کے گزارتے ہیں۔ یہ موسم سرما میں کم بلندیوں پر اتر آتے ہیں۔ جہاں کم یا ہلکی برف باری ہوتی ہو۔ موسم گرما میں یہ صرف دن کو صبح اور پچھلے پہر فعال ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس موسم سرما میں سارا دن فعال رہتے ہیں۔ بڑی عمر کی نر روازانہ بہت تھوڑی دیر کے لیے غذا حاصل کرتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بہت کم غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ مارخور سخت گھاس اور کئی قسم کی جنگلی جھاڑیوں کے پتے کھاتے ہیں۔ اگر گھاس میسر نہ ہو تو مارخور شاہ بلوط اور ترخا جھاڑی (Artemisia) کے پتے کھا لیتے ہیں۔ اگر پتے اونچائی پر ہوں تو مارخور چھوٹے پودوں کے تنوں پر حیرت انگیز طور پر چڑھ جاتے ہیں۔ زیادہ تر بلند ڈھلانوں پر مارخور چرتے نظر آتے ہیں۔ پانی پینے کے لیے صرف غروب آفتاب کے وقت چشموں اور ندیوں پر جاتے ہیں۔ یہ وہاں بڑی احتیاط سے پہنچتے ہیں۔

مارخوروں میں بچے مئی اور جون میں ایک یا دو فی مادہ کے حساب سے پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک مادہ بیک وقت تین بچے بھی دے دیتی ہے۔ مادہ بچے بہت محفوظ اور خفیہ جگہ پر دیتی ہے۔ جہاں وہ اپنی زندگی کے پہلے چند ہفتے رہ کر گزارتے ہیں۔ مائیں ان کی پوشیدہ جگہوں سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو کر انہیں آواز نکال کر بلاتی اور دودھ پلاتی ہیں۔ مارخور عام طور پر دس سال کی عمر پاتے ہیں۔ بعض کی عمر 11، 12 سال بھی ہوتی ہے۔

گلگت اور چترال میں برفانی تیندوے باقاعدگی سے مارخوروں کا شکار کرتے ہیں۔ سنہری عقاب بعض اوقات مارخوروں کے نوزائیدہ بچوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ انسان ہر جگہ مارخوروں کا بڑا دشمن ہے۔ بعض اوقات مارخوروں کے جسم میں ہائپوڈرما (Hypoderma sp) نامی کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وباؤں کے پھیلنے سے بھی ان کی ہلاکت ہو جاتی ہے۔ مارخور ہمارے جنگلوں کا حسن ہیں۔ ہمیں ان سے محبت کرنی چاہیے اور ان کے تحفظ کے لیے عملی اقدام کرنے چاہئیں۔

آپ بھی لکھیے

Sharjeel Ahmed

یہ ہسپتال ہے

قاری محمد افضل کلیم، بستی رحیم کلی

دنیا خواب غفلت میں محو تھی اور شیطان کسی بدترین منصوبے کو آخری شکل دینے کے لیے انتہائی خفیہ طریقے پر اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی نے اس کی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا۔ وہ صبح ہونے سے پہلے اپنے منصوبے کو عملی شکل دینا چاہتا تھا۔ پچھلے پہر کا وقت ہو گیا۔ آہستہ آہستہ لاتعداد مسلح فوجیں بڑھنے لگیں اور چوروں کی طرح پاکستان کی حدود میں داخل ہو گئیں۔ توپیں گولے داغنے لگیں۔ ٹینک آگ اگلنے لگے۔ بندوقیں گولیاں برسانے لگیں۔ پاکستان کی سرحدوں کے محافظوں نے مکار دشمن کو روکا۔ لڑائی چھڑ چکی تھی اور صبح ہوتے ہوتے پورے پاکستان میں جنگ کا شور مچ گیا۔

یہ 6 ستمبر 1965ء کی صبح تھی۔ بھارتی طیارے نہتے شہریوں اور بے خبر دیہاتیوں پر بموں کی بارش کر رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک بھارتی طیارہ ایک پہاڑی کے دامن میں آگرا۔ یہاں درختوں کی کثرت تھی۔ آبادی بہت کم تھی۔ زمین کی اونچی نیچی سطح پر کہیں کہیں کوئی جھونپڑی یا کچا مکان دکھائی دیتا تھا۔ بھارتی طیارے کے ہوا باز نے جہاز میں سے شعلے نکلتے ہوئے دیکھے تو اپنے بچاؤ کے لیے نیچے چھلانگ لگا دی مگر پیراشوٹ ٹھیک سے نہ کھل سکا۔ وہ لڑھکتا ہوا پہاڑی کے دامن میں ایک جھاڑی کے قریب آگرا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ایک بازو بھی بے کار ہو گیا اور وہ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ طیارہ ہوا باز سے کچھ فاصلے پر گرا اور جل کر خاکستر ہو گیا۔ طیارہ گرنے سے زور دار دھماکا ہوا اور جنگل کی خاموشی ٹوٹ گئی۔ قریب کے ایک مکان کی کچی دیواریں گر گئیں۔ یہ مکان ایک غریب کسان کا تھا۔ اس کے بیوی بچے گھبرا گئے۔ بیوی نے کہا "ہائے اللہ یہ کیا ہوا؟ کیا جنگ اس ویرانے میں بھی پہنچ گئی؟"

کسان نے بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا "اگر موت آگئی ہے تو بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ دیکھتے ہیں یہ کیسا دھماکا ہے اور کہاں ہوا ہے؟

غرض وہ میاں بیوی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ اس آواز کے رخ پر چلے اور تھوڑی ہی دیر میں اس جلے ہوئے طیارے تک پہنچ گئے۔

"اتنا بڑا طیارہ اور جلا ہوا" کسان نے چیختے ہوئے کہا۔ "یہ بھی دشمن کی لاش ہی ہے۔ ہمارے شہبازوں نے اسے مار گرایا ہو گا"۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا پھر وہ چلایا "مگر ہوا باز دشمن کہاں گیا"

بیوی نے کہا "کم بخت جل گیا ہو گا"۔

"طیارے کے اندر جلتا تو کم سے کم جلی ہوئی لاش تو دکھائی دیتی۔ یہاں تو ہڈی کا نام نشان نہیں۔ میرا خیال ہے وہ جلا نہیں ہو گا۔ ضرور کہیں کود گیا ہو گا۔ یہ ہوا باز چھتری جیسی ایک چیز کے ذریعے چھلانگ بھی لگا دیتے ہیں۔ آؤ ذرا ادھر ادھر دیکھیں میاں نے کہا"

تینوں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ ایک جھاڑی کے قریب سے گزرے تو کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ آواز کے رخ پر چلے تو کچھ ہی فاصلے پر ہوا باز کو اوندھے منہ پڑے ہوئے پایا۔

"زندہ ہے..... ظالم تڑپ تڑپ کر مرے گا۔ مرنے دو دشمن کو! آؤ گھر چلیں اور گری ہوئی دیوار کو ٹھیک کریں" کسان نے کہا۔ لیکن اس کے سینے میں مسلمان کا دل تھا جو چپکے چپکے اس سے کہہ رہا تھا۔ "بے شک یہ دشمن ہے مگر اس وقت تو بے بس ہے۔ مرتے کو مارنا یا مرنے دینا مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ انسان انسان کا دوست بھی ہوتا ہے اور دشمن بھی مگر انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ اس بے بسی کی حالت میں اس کی مدد کی جائے اور میرا مذہب مجھے یہی سکھاتا ہے"۔

اتنے میں کسان کے بیٹے نے کہا "اس دشمن کی موت پر ہمیں ایسی خوشی ہونی چاہیے جیسی اس جلے ہوئے جہاز کو دیکھ کر ہو رہی ہے۔ پڑا رہے یہیں مردار' گیدڑ اور بھیڑیے اس کی لاش کو چیریں' نوچیں' بھنبوڑیں اور مزے اڑائیں"۔

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باپ نے ایک بدلے ہوئے لہجے میں کہا "یہ دشمن ہے مگر انسان بھی تو ہے۔ اس وقت اس کی حالت دیکھو۔ اس وقت یہ دشمن ہے نہ کچھ اور صرف ایک ادھ موا انسان ہے"۔

کسان کی بیوی اور بیٹے پر ان باتوں کا اثر ہوا۔ تینوں نے اس نیم مردہ دشمن ہواباز کو اٹھایا اور بڑی مشکل سے اپنے گھر تک لے آئے۔ چند قطرے پانی کے اس کے حلق میں ٹپکائے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بیوی نے جلدی سے چائے کی پیالی تیار کر کے اسے پلائی۔ وہ اس نے جوں توں پی لی مگر پھر بھی بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ کسان نے اپنی بیوی سے کہا۔ "ہماری فوج اس گرے ہوئے طیارے کو دیکھنے ضرور آئے گی۔ ہواباز کو وہاں نہ پایا تو اس کو تلاش کرے گی۔ ہم انسانیت کی تلاش میں اسے یہاں لے آئے ہیں مگر کہیں پکڑے نہ جائیں!"

بیوی نے کہا "واہ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ہمارے فوجی بھی تو مسلمان ہیں۔ انسانیت کا احترام ان کے دلوں میں ہماری نسبت کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ میاں بیوی یہ باتیں کر رہے تھے کہ پولیس وہاں پہنچ گئی۔ طیارہ جلا ہوا تھا مگر ہواباز کا کہیں پتا نہ تھا۔ تلاش کرتے کرتے وہ لوگ جلد ہی کسان کے گھر تک پہنچ گئے۔ انہوں نے کسان سے پوچھا۔ "یہاں دشمن کا کوئی آدمی تو نہیں آیا؟ دشمن ہواباز کہیں چھپ گیا ہے"۔

کسان نے جواب دیا "وہ خود کہیں نہیں چھپا۔ وہ میرے گھر کے اندر بے ہوش پڑا ہے۔ ہم اسے یہاں اٹھا کر لے آئے ہیں"۔

پولیس نے ہواباز کو وہاں سے اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور ہسپتال پہنچا دیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے فوری طور پر اس کا علاج شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دشمن ہواباز کو ہوش آ گیا۔ اس نے حیرانی سے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ بہت سے زخمی بستروں پر پڑے کراہ رہے تھے۔ ہسپتال کا عملہ اور ڈاکٹر بڑی ہمدردی کے ساتھ ان کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ وہ حیران تھا کہ مسلمان عجیب قوم ہے۔ میدان جنگ میں دشمن اور ہسپتال میں غم خوار و غم گسار۔ اس نے تو یہی کچھ سیکھا اور سنا تھا کہ مسلمانوں پر کبھی رحم نہ کرو' دشمن کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ وہ دیر تک سوچتا رہا۔ اسے حیرت تھی کہ مسلمانوں کے بارے میں اسے جو کچھ بتایا گیا تھا وہ کس قدر غلط تھا۔ ان کے حسن سلوک نے اس کی آنکھوں پر پڑے ہوئے تعصب کے پردے کو چاک کر دیا تھا۔ اگلی صبح تک اس نے دیکھا کہ ہسپتال میں ایک ہجوم جمع ہو گیا ہے۔ یہ سب پاکستانی مسلمان تھے جو زخمیوں کے لیے خون کا عطیہ دینے آئے تھے۔ ان کے جسموں سے لیا گیا خون صرف مسلمان زخمیوں ہی کے لیے نہ تھا' بلکہ ہر زخمی انسان کے لیے تھا۔ مسلمان ڈاکٹر ہندو زخمیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کو دوائیں پلائی جا رہی تھیں۔ خون کی بوتلیں لگائی جا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی دل جوئی بھی کی جا رہی تھی۔

ان میں سے بعض کے چہروں پر وحشت کے آثار دیکھ کر بڑے ڈاکٹر نے کہا "تم حیران کیوں ہو رہے ہو؟ بے شک میدان جنگ میں تم ہمارے دشمن تھے مگر یہ میدان جنگ نہیں ہسپتال ہے۔ یہاں تمہاری حیثیت صرف مجبور اور بے وطن انسانوں کی ہے اور انسانیت کا احترام ہمارے نزدیک فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم اپنے خون سے تمہارے جسم کو توانائی دیں گے"۔

پھر یہ جنگ ختم ہو گئی۔ زخمی دشمن تن درست ہو کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔ ان کے ساتھ ہی وہ ہواباز روانہ ہو گیا۔ یہ واقعہ برسوں پرانا ہو چکا مگر احترام انسانیت کا جو نمونہ دشمن ہواباز نے یہاں دیکھا تھا اس کی یاد شاید اب بھی اس کے دل میں تازہ ہو (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

ہرگز نہیں

الطاف حسین' کراچی

پاک فضائیہ کے چار لڑاکا طیارے 20 ہزار فٹ کی بلندی پر لاہور اور قصور کے درمیان گشتی پرواز کر رہے تھے کہ اچانک ان کے ریڈیو سیٹ پر ائیر ٹریفک کنٹرولر نے شمال کی طرف سے دشمن کے چار طیاروں کے آنے کی اطلاع دی..... جس کے فوراً بعد چاروں ہواباز اپنے طیاروں کو غوطہ دے کر 10 ہزار فٹ کی بلندی پر آ گئے..... اب وہ پاکستان کے دل' لاہور پر چکر کاٹتے ہوئے آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر دھندلی

فضا میں دشمن کے طیاروں کو تلاش کر رہے تھے۔ جب کہ نیچے زندہ دلان لاہور خطرے کا سائرن بجنے کے باجود بے فکری سے سڑکوں پر گھومتے پھر رہے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ جب تک اللہ کی مدد شامل حال ہے اور ان کے محافظوں کی آنکھیں کھلی ہیں دشمن انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

فضا میں موجود پاکستانی ہوابازوں کو اس منظر نے نئی قوت اور نیا ولولہ دیا تھا۔ وہ بھی اپنے ہم وطنوں کی اس دلیری اور جرات مندی کا مطلب بہت اچھی طرح جان گئے۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ پہلے سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ دشمن کو تلاش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ بھارتی طیارے اس ہنستی بستی آبادی پر بم گرائیں وہ اس کہانی کا رخ موڑ دینا چاہتے تھے۔ آخر کار انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں اور ایک ہواباز نے سب سے پہلے ان بھارتی لڑاکا طیاروں کو دیکھ لیا جو ان سے قدرے کم بلندی پر رہتے ہوئے لاہور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس نے فوری طور پر فارمیشن لیڈر کو اطلاع دی جو دوسرے ہوابازوں نے بھی اپنے ریڈیو سیٹ پر سن لی۔ چاروں نے بیک وقت تیل کی فالتو ٹنکیاں ریلیز کیں لمحوں میں مشین گنوں کے بٹن اور سوئچ وغیرہ چیک کرنے کے بعد اب وہ یہ معرکہ لڑنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد حق و باطل کی جنگ شروع ہو گئی۔ فضا مشین گنوں کی ہیبت ناک فائرنگ اور دل دہلا دینے والی آوازوں سے گونجنے لگی۔ نیچے چلنے پھرنے والے لوگ اب جگہ جگہ ہجوم کی شکل میں جمع ہو کر زندگی اور موت کے اس معرکہ کو نہایت دل چسپی سے دیکھ رہے تھے اور وقفے وقفے سے جوشیلے نعرے بھی لگا رہے تھے۔

دونوں طرف کے طیاروں کے درمیان آنکھ مچولی کا سلسلہ جاری تھا۔ پاک فضائیہ اور دشمن کے طیارے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے اور مشین گنوں کے برسٹ فائر کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے پیچھے غوطے لگا رہے تھے۔ پینترے بدل بدل کر تعاقب کر رہے تھے۔ قلابازیاں کھا کر ایک دوسرے کو جل دے رہے تھے۔ ان کے انجن اور فائروں کی گھن گرج نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا..... ایک موقع پر اچانک ایک ہنٹر طیارہ فارمیشن لیڈر کے طیارے کی مشین گن کی زد میں آگیا۔ بھارتی ہواباز نے اس کی رینج سے نکلنے کے لیے کئی بار پینترے بدلے لیکن آخر کار میجر کی مشین گنوں سے نکلا ہوا ایک برسٹ کام کر گیا اور طیارہ اپنے پیچھے سیاہ دھواں چھوڑتا ہوا سرحد کی طرف گرنے لگا۔

"نعرہ تکبیر" عین اسی لمحے ہجوم میں سے کسی نے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے نعرہ لگایا۔

"اللہ اکبر" جس کا جواب اس سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اس ولولہ انگیز شور میں ایک چھوٹی مگر تیز آواز بھی شامل تھی اور یہ آواز ایک دس سالہ بچے مبشر علی کی تھی جو بیچ بازار تنہا کھڑا تھا۔

فضائی معرکہ میں اب پہلے سے زیادہ تیزی آگئی تھی کیوں کہ اسی دوران میں چار اور بھارتی لڑاکا طیارے بھی کہیں سے آکر اس جنگ میں شامل ہو گئے تھے۔ اب چار کے مقابل سات دشمن تھے لیکن اس کے باوجود پاکستانی شاہباز حوصلے قائم رکھے ہوئے تھے اور نہایت دلیری کے ساتھ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے۔ چند منٹ بعد ایک شاہباز نے ایک اور بھارتی ہنٹر کو آگ دکھا کر جھکنے پر مجبور کر دیا۔

"بولو بولو بولو نعرہ حیدری" دشمن کا دوسرا طیارہ تباہ ہوتا دیکھ کر اسی چھوٹے سے بچے نے خوشی سے مکا لہراتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

"یا علی" لوگوں نے فخریہ انداز میں مبشر علی کی طرف دیکھا اور پھر ان کے جواب کی شدت نے لاہور کو ہلا کر رکھ دیا۔

اس وقت زندہ دلان لاہور کے احساسات دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ زمین پر مکے لہرا لہرا کر فضا میں موجود اپنے شیر دل ہوا بازوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

"بیٹے تم گھر بھاگ جاؤ..... جہاز اب بہت نچلی پرواز کرتے ہوئے گولیاں برسا رہے ہیں..... کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی طیارے کی گولی تمہیں لگ جائے۔ چند قدم کے فاصلہ پر کھڑا ایک آدمی ننھے مبشر کی طرف دیکھتے ہوئے چلایا۔

"چچا میں ایسا نہیں کر سکتا" مبشر علی نے دو ٹوک جواب دیا۔ "اگر میں گھر میں جا کر چھپ گیا تو میرے محلے کے ہندو لڑکے بھی مجھے بزدلی کا طعنہ دیں گے..... اور میں بزدل نہیں ہوں چچا! اس قوم کا بیٹا ہوں جو موت سے نہیں ڈرتی بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے لڑتی ہے"

ننھے مبشر علی کے جواب میں غیرت تھی، دلیری تھی اس کا چہرہ جوش کی شدت سے تمتما رہا تھا..... جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا

جیسے اس کے وجود کا سارا خون اس کے چہرے پر اتر آیا ہے۔اس آدمی نے حیرت بھرے انداز میں اس چھوٹے سے بہادر بچے کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے خوشی اور فخر کا اظہار آنسو بن کر بہ نکلا۔اگلے لمحے وہ جذبات سے دیوانہ ہو کر آگے بڑھا اور ننھے مبشر علی کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا۔"جس قوم کے ایک چھوٹے سے بچے کے جذبات اور احساسات یہ ہوں کیا دنیا کی کوئی طاقت اسے جھکا سکتی ہے.....ہر گز نہیں"(دوسرا انعام:90روپے کی کتابیں)

آہ وہ لمحے

بشریٰ فیاض'ڈنمارک

"آپ لوگ سو جائیں'دیر ہو رہی ہے" یہ بات کوئی تیسری چوتھی دفعہ ابو ہمارے کمرے میں آ کے کہہ چکے تھے لیکن ہم کیا کرتے۔نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔خوشی کے مارے ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وقت گزر ہی نہیں رہا۔آخر صبح کے تین بجے بابا جانی آئے۔انہوں نے ہمیں وہ ڈانٹ پلائی کہ ہمیں مجبوراً بستروں میں گھسنا پڑا۔حال آں کہ ہم لوگ پاکستان جانے کی خوشی میں ساری رات جاگ کے گزار سکتے تھے۔ہفتے والے دن چار بجے ہماری فلائیٹ تھی لیکن ہم صبح گیارہ بجے کے تیار بیٹھے تھے۔ہم بہن بھائیوں کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ہم جہاز کو پکڑ کے اپنے گھر کے سامنے لا کھڑا کرتے اور باقی مسافروں کو ادھر ہی چھوڑتے اور خود پاکستان پہنچ جاتے۔

گھر سے ہوائی اڈے تک کا سفر بھی بہت خوش گوار گزرا کیوں کہ ہمارے تایا ابو کی فیملی بھی ہمارے ساتھ جا رہی تھی۔اللہ اللہ کر کے جہاز اڑا تو ہم نے شکر کا کلمہ ادا کیا۔جہاز میں سات گھنٹے کا سفر ہمیں ایسے لگا جیسے سات دنوں کا سفر ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا۔اس سے پہلے کہ ہم خود جہاز سے اترتے اور جہاز کو دھکا لگانے کے بارے میں سوچتے کہ یہ جلدی منزل پر پہنچے'فضائی میزبان نے اعلان کر دیا کہ تھوڑی دیر تک ہم پاکستان کی سرزمین پر ہوں گے۔ہمارے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انکل نے خوشی کا یہ انوکھا طریقہ پہلی دفعہ دیکھا تھا اس لیے پوچھے بغیر نہ رہ سکے "بیٹے'آپ لوگ پہلی دفعہ پاکستان جا رہے ہیں"

"جی انکل'ہم سب لوگ چھوٹے چھوٹے تھے جب ادھر آ گئے اور پھر پڑھائی کی وجہ سے جانا نہ ہوا اور اب ہم پہلی دفعہ جا رہے ہیں" ہم نے انکل کی بات کا تفصیلی جواب دیا۔

ہوائی اڈے سے باہر نکلے تو ہم نے اپنے احباب پر نظریں دوڑانا شروع کر دیں جنہوں نے ہمیں لینے آنا تھا۔آخر وہ ہمیں نظر آ گئے۔ایک عدد بس کے ساتھ'جی ہاں ہم بندے بھی زیادہ تھے اس لیے ہمیں بس پر بیٹھ کے گھر جانا تھا۔ہمارے لیے بس پر بیٹھنا پہلا تجربہ تھا جس کو ہم نے کافی انجوائے کیا۔چار گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لوگ گھر پہنچ گئے جہاں پر نہایت ہی پرجوش طریقے سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ہر کسی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔خصوصاً دادی اماں نے اپنی ساری آل اولاد کو سامنے دیکھ کے دو تین بکرے ذبح کروا کے مسکینوں میں بانٹے کہ شکر ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو پھر ان سے ملایا تھا۔ہم لوگوں نے مہینا بھر گھر رہنا تھا اور اس مہینے میں دو تین شادیاں بھی ہونی تھیں جن کی تیاری میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور واپسی کا دن آ گیا۔جاتے ہوئے ہم لوگ جتنے خوش تھے آتے ہوئے اتنے ہی اداس ہو گئے۔خیر رو دھو کے ہم لوگ واپس آ گئے کیوں کہ یہاں ہمارے اسکول کھلنے والے تھے۔آج بھی جب ہم وہ وقت یاد کریں تو بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔"ایسا لگتا ہے ہم خواب میں پاکستان گئے تھے"کیوں کہ وقت ہی اتنی جلدی گزر گیا تھا اور اب ہم ایک بار پھر اس خوب صورت دن کا انتظار کر رہے ہیں جب ہم دوبارہ پاکستان جائیں گے (تیسرا انعام: 80روپے کی کتابیں)

درختوں کی فریاد

طوبیٰ حق'کراچی

بازار میں ہر طرف بے ہنگم شور برپا تھا۔ایک طرف گاڑیوں اور ویگنوں کا شور تو دوسری طرف خوانچہ فروشوں کی چلاتی ہوئی آوازیں۔یہ آوازیں کسی انسان کو پاگل کر دینے کے لیے کافی

تھیں لیکن لوگ شاید ان آوازوں کے عادی ہو گئے تھے۔ جبھی تو زیادہ تر لوگ قدرے اطمینان کے ساتھ خریداری میں مصروف تھے۔ فٹ پاتھ کے ساتھ لگے چند ویران درخت اپنی تباہی کا رونا رو رہے تھے۔

پیپل کا درخت جو عمر میں سب درختوں سے بڑا تھا اور سب درخت اس کی بات توجہ سے سنتے تھے' بولا "آہ! انسان نے اپنی تباہی اور بربادی کا سامان خود کیا ہے۔ ان گاڑیوں سے اٹھتا ہوا دھواں پھیپھڑوں اور جلد کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس کالے دھویں میں موجود نقصان دہ ذرات کئی تنفسی اور جلدی بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ اور تو اور ہم درختوں کے پتے زرد ہو جاتے ہیں اور پھل پھول بننے کی صلاحیت بھی کم ہو جاتی ہے"۔

"اور یہ شور" بوڑھے درخت نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "اس شور سے تو کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کو دیکھو چہروں سے کس قدر اطمینان جھلک رہا ہے"۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک گاڑی' جس میں تیز آواز میں گانے لگے ہوئے تھے' پلک جھپکتے گزر گئی۔ سفیدے کا ننھا سا درخت دھک سے رہ گیا۔ اسے خوف زدہ دیکھ کر سفیدے کا نوجوان درخت بولا "میرے ننھے دوست' اب تم ان باتوں کے عادی ہو جاؤ۔ جب انسان کو اپنے نقصان کی کوئی پروا نہیں تو ہماری کیا خاک ہو گی"۔

"وہ دیکھو" نوجوان درخت نے اشارہ کرتے ہوئے کہا "سامنے پرائمری اسکول ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ جب کسی اسکول یا ہسپتال کے سامنے سے گزرتے ہیں تو نہ تو ہارن بجاتے ہیں اور نہ گاڑی کی رفتار تیز رکھتے ہیں لیکن یہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ ہمیشہ اس کے برعکس ہوتا ہے"۔

"انسان کی بے حسی اور خود غرضی کی جیتی جاگتی تصویر تو ہم ہیں"۔ ہمارے ہی دم سے اس دھرتی پر انسان کا وجود قائم ہے۔ ہم ماحول کو آلودگی سے پاک رکھنے میں کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمیں زمین کے پھیپھڑے کہا جاتا ہے لیکن انسان کو اس بات کا ہوش کہاں۔ اسے تو بجائے ہماری تعداد بڑھانے کے ہمیں کاٹ کر پیسا کمانے کی فکر رہتی ہے۔ کاش! انسان کو اپنی مکمل تباہی سے پہلے اس بات کا احساس ہو جائے"۔ نیم کے درخت نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ابھی نیم نے اپنی بات مکمل کی ہی تھی کہ ایک بے قابو ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھ دوڑا۔ بجلی کے تار' کئی درخت اور ایک کار اس تیز رفتاری کی زد میں آکر تباہ ہو گئے۔ اب تمام درخت رو رہے تھے' فریاد کر رہے تھے مگر لوگوں کو اس کی فکر کہاں تھی۔ کچھ دیر بعد سڑک پر ٹریفک اسی طرح رواں دواں تھیں (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

نقش قدم

راشدہ رفعت' بہاول پور

پاک بھارت سرحد پر حالات بہت خراب تھے۔ دشمن آئے روز سرحدی علاقوں پر گولہ باری کرتا۔ معصوم شہریوں کی جانوں کو نقصان پہنچاتا۔ ایک دو مقام سے یہ خبر بھی ملی تھی کہ دشمن کے دستوں نے سرحدوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ پاک فوج بھی پوری طرح چوکس تھی۔ ایک بہت اہم اور حساس چوکی پر پاک فوج نے کیپٹن علی تیمور کو تعینات کیا تھا۔ کیپٹن علی تیمور بہت بہادر اور دلیر افسر تھے۔ دشمن کے ممکنہ حملوں سے نمٹنے کے لیے انہوں نے حکمت عملی تیار کر لی تھی۔ ایک رات بزدلوں کی طرح دشمن کے دستوں نے کیپٹن علی کی چوکی پر شب خون مارا۔ کیپٹن علی اپنے جوانوں کے ساتھ نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے نہ صرف دشمن کی پیش قدمی کو روکا بلکہ انہیں زبردست جانی اور مالی نقصان بھی پہنچایا مگر اس معرکے میں ایک گولی کیپٹن علی کو شہادت کے مرتبے پر فائز کر گئی۔ شہادت کے بعد ان کے سامان سے ایک خط ملا۔ ان کے ساتھیوں نے وہ خط اپنے کمانڈر شبیر کو پہنچا دیا۔ خط کی عبارت یہ تھی۔

"پیارے ابا جان' السلام علیکم! آج میں بہت خوش ہوں۔ میں اپنی زندگی میں جس لمحے کا انتظار کرتا رہا ہوں وہ لمحہ اب آن پہنچا ہے۔ مجھے اس پاک سرزمین کی حفاظت کے لیے سرحد پر طلب کر لیا گیا ہے۔ دشمن کے ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے مگر ہم اسے ہر محاذ پر شکست دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے حوصلے بلند ہیں۔

وطن پر کٹ مرنے کی آرزو ہماری شریانوں میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔ اگر دشمن کے ساتھ مقابلہ ہوا تو آپ کا بیٹا پیٹھ نہیں دکھائے گا۔ میں اپنے بہادر باپ کے نام کی لاج رکھوں گا۔ آپ کا بیٹا: کیپٹن علی تیمور"

خط پڑھنے کے بعد کمانڈر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"سر اسے کہاں پوسٹ کیا جائے جب کہ اس پر کوئی پتا درج نہیں"۔ حوال دار رفیق نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

"اسے کہیں پوسٹ نہیں کرنا ہے۔ یہ خط جہاں بھیجنا تھا وہاں کیپٹن علی تیمور خود پہنچ کر رپورٹ کر چکا ہو گا" کمانڈر صاحب نے نم ناک لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب سر؟" حوال دار رفیق نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رفیق علی کے والد کون ہیں؟"

کمانڈر صاحب کے پوچھنے پر حوال دار رفیق نے نفی میں سر ہلادیا "سنو، کیپٹن علی تیمور کے والد میجر تیمور احمد 1965ء کی جنگ کے ہیرو ہیں۔ انہوں نے دشمنوں کا دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہادت پائی اور انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علی نے شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔ کیپٹن علی عظیم باپ کا عظیم بیٹا تھا۔ میں دفاع وطن کے لیے جان قربان کرنے والوں کو سلام کرتا ہوں" کمانڈر صاحب نے زوردار سیلوٹ کیا (پانچواں انعام: 60 روپے کتابیں)

آخری دن

ناہید انجم، لاہور

"میرا اسکول میں پہلا دن" اس عنوان سے آپ نے کئی واقعات پڑھے اور سنے ہوں گے لیکن میں آپ کو اسکول میں آخری دن کی روئیداد سنا رہی ہوں۔

معمول کی کلاس جاری تھی اور آج ہمارا اسکول میں سر عظیم کے ساتھ آخری پریڈ تھا۔ پورے ایک ماہ بعد ہمیں میٹرک کے امتحان دینے کے لیے کسی اور اسکول جانا تھا۔ سر نے اس روز ہمیں بہت ساری نصیحتیں کی تھیں۔

"پیارے بچو! کبھی ہمت نہ ہارنا۔ اپنی ناکامی پر مایوس نہ ہونا۔ خدا کفر کو اتنا ناپسند نہیں کرتا جتنا مایوس بندہ کو' اس لیے اپنے اندر سے مایوسی کو نکال پھینک دو اور ہمت و حوصلے کے ساتھ محنت کرو"۔

ہم سب نے ٹیچر سے وعدہ کیا کہ کہ ان شاء اللہ ہم ایسا ہی کریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے تختہ سیاہ پہ جلی الفاظ میں یہ سوال لکھ ڈالا۔ "اپنے استاد کی پانچ پانچ خوبیاں اور کم زوریاں لکھیں"۔

اس سوال کا جواب لکھنا ہر بچے کے لیے لازمی تھا۔ مگر سر عظیم کی خوبیوں کو تو لکھا جاسکتا تھا لیکن کم زوریاں لکھتے وقت میں کیا لکھتی۔ مگر اس سوال کا جواب لازمی تھا اس لیے میں نے لکھا۔ "ہمارے استاد محترم بہت نیک اور مہربان ہیں۔ وہ ہمیں بڑی محنت سے پڑھاتے ہیں۔ ہمارے سر عظیم بہت ایمان دار ہیں۔ وہ وقت کے بھی بہت پابند ہیں۔ سر عظیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لباس کے معاملے میں بڑے حساس ہیں۔ کپڑے اگرچہ قیمتی نہیں لیکن بہت صاف ستھرے اور بغیر شکن کے پہنتے ہیں۔

یہ تو تھیں سر عظیم کی خوبیاں۔ اب مجھے ان کی کم زوریوں کا جائزہ لینا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا چھوڑو کیا لکھنا ہے۔ مگر اس طرح تو میرا جواب ادھورا رہ جاتا۔ چناں چہ میں نے ان کی کم زوریاں کچھ یوں بیان کیں۔ "سر عظیم بہت غصیلی طبیعت رکھتے ہیں مگر وہ طلبا کو ڈانٹنا پسند نہیں کرتے۔ صرف آنکھ سے گھور کر اپنے غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کی سب سے بڑی خامی ہے۔ وہ ایمان دار ہیں جب کہ اس دور میں بے ایمان بندہ جلدی ترقی کرتا ہے۔ میں ان کی ایمان داری کو ان کی کم زوری سمجھتی ہوں۔ اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو ان کا گریڈ بھی جلد اپ ہو جاتا۔ کیوں کہ وہ جتنے محنتی اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں اس لحاظ سے انہیں کسی اعلیٰ درجہ پہ ضرور فائز ہونا چاہیے تھا"۔

یہ سب کچھ لکھ کر میں نے پرچہ سر کے حوالے کر دیا۔ میں اس وقت آخری طالبہ کی حیثیت سے ان کے پاس موجود تھی۔ ٹیچر نے حسب روایت مجھے گڈ لک کہا اور کلاس روم سے باہر چلے گئے۔ اس کے بعد مجھے بھی گھر جانا تھا۔ کیوں کہ آج میرا اسکول میں آخری دن تھا (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

***

Sharjeel Ahmed

کارٹون کہانی

شاہد
ریاض
شاہد

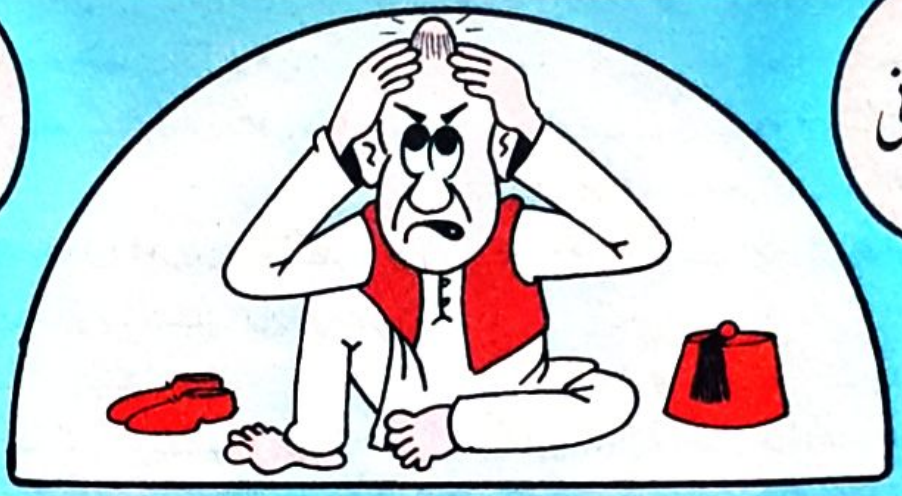

ایک دن گنجو میاں نے ملک صاحب کو پھنسانے کی اسکیم بنائی۔ وہ ایک میچ کے دو ٹکٹ لائے اور ملک صاحب سے کہا

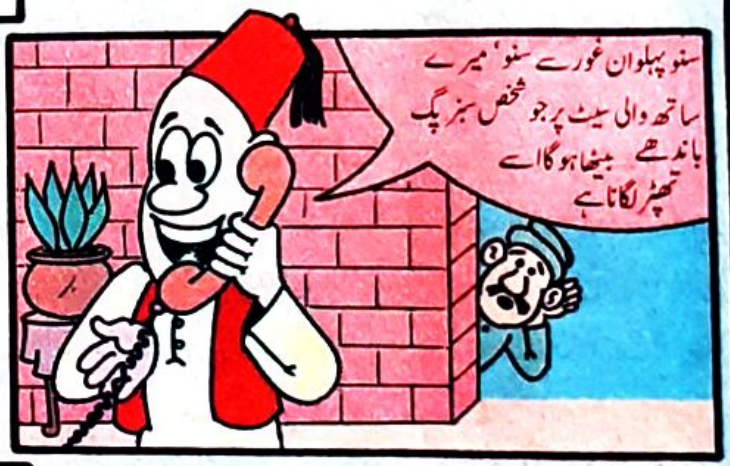

گنجو میاں ملک صاحب کو بٹھا کر دوسرے کمرے میں گئے اور وہاں سے اپنے ایک پہلوان دوست کو فون کیا۔ مگر ملک صاحب بھی چھپ کر ان کی باتیں سننے لگے

اسٹیڈیم پہنچے تو گنجو میاں کو میچ کے دوران میں نیند آنا شروع ہو گئی اور وہ گہری نیند سو گئے۔

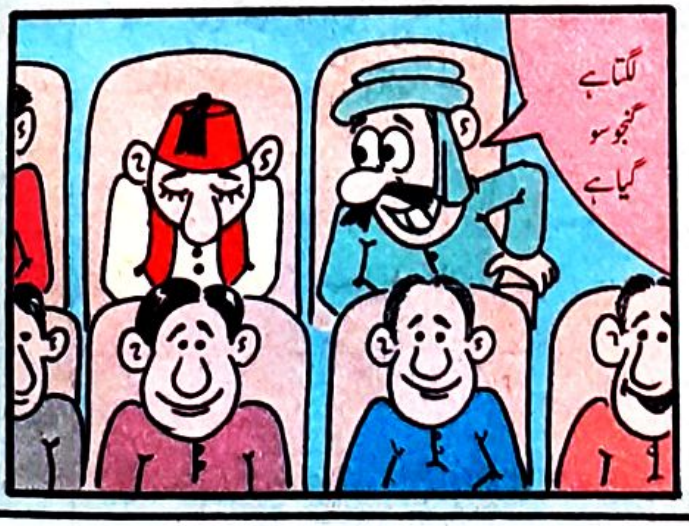

پھر ملک صاحب نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور اپنی پگ گنجو میاں کے سر پر اور ان کی ٹوپی اپنے سر پر رکھ لی

اب گنجو میاں کو نانی یاد آئے گی

ہاں یہی ہے۔ وہ جس کا گنجو میاں نے مجھے بتایا تھا

تھوڑی دیر بعد پہلوان صاحب اسٹیڈیم میں آن پہنچے۔ انہوں نے گنجو میاں کو وہی سبز پگ والا آدمی سمجھ لیا جس کے بارے میں گنجو نے بتایا تھا۔

پھر پہلوان صاحب نے یک دم پگ اٹھا کر ایک زور دار تھپڑ گنجو میاں کے سر پر رسید کر دیا۔

ٹھاہ!!!

آداب عرض گنجو میاں

اتنا زور دار تھپڑ کھا کر گنجو میاں کی نیند تو اڑ ہی گئی مگر وہ کچھ سمجھ نہ سکے کہ معاملہ کیا ہے مگر جب ان کی نظر ملک صاحب کے سر پر پڑی تو وہ ساری صورت حال سمجھ گئے لیکن اب سوائے سر کو سہلانے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

Sharjeel Ahmed

بوندیں

سید عظیم واسطی

چلو چلو بھاگے آؤ تم کو گیت سناؤں
کیسے آجاتی ہیں بوندیں یہ تم کو بتلاؤں
ہرا سمندر اس کونے سے اس کونے تک پھیلا
جب تم دونوں گئے کراچی تم نے دیکھا ہو گا
دیکھی ہوں گی تم نے اکثر اونچی اونچی لہریں
ایسی لہریں ایک جگہ جو لمحہ بھر نہ ٹھہریں
سورج چاچا کو آیا ہے جب لہروں پر غصہ
اس نے شعلہ آنکھیں کر کے ان لہروں کو گھورا
گرمی سے سورج کی بن کر بھاپ' اڑیں سب لہریں
ایسی لہریں ایک جگہ جو لمحہ بھر نہ ٹھہریں
بھاپ ہوا سے ہلکی ہے سو اوپر اٹھتی جائے
تھوڑی تھوڑی ہو کے اکٹھی گردوں پر جا چھائے
اوپر جا کر رنگت بدلی اور کہلائی بادل
ہوا چلی تو ساتھ میں اپنے گھیر کے لائی بادل
بھاگیں بادل اودے اودے آپس میں ٹکرائیں
بھاپ کی بن کر موٹی موٹی بوندیں نیچے آئیں
یوں آتی ہیں بوندیں بچو یاد کرو تم سارے
ایک کہانی نئی سنائیں گے پھر بھیا پیارے

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان
بھیجنے کی آخری تاریخ 7 ستمبر 2000ء

بلاعنوان

اگست 2000ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ 6 ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

☆ ثنا خالد' لاہور (بندہ حال کا عکس مستقبل کا، پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
☆ سمیعہ علی ڈھکو' شور کوٹ (یہ آئینہ ہے یا حجام کا استرا' دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)
☆ عنبر عابد' لاہور (ہائے میرا مستقبل تو بالکل صاف ہے' تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)
☆ زاہد عمر' راول پنڈی (آج بال تو کل فٹ بال' چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
☆ فاطمہ فاروق' ڈیرہ اسماعیل خان (ہائیں میری وگ تو باتھ روم میں رہ گئی' پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)
☆ طاہر چوہان' گوجرانوالہ (یہ شیشے کا کمال ہے یا شیمپو کا! چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
O. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00